ایشیائی شاعری

بہ سلسلہ شعبۂ علمی

محمڈن اینگلو اورئنٹل ایجوکیشنل کانفرنس

تصنیف

مولوی سید امجد علی صاحب اشہری

خواجہ صدیق حسین کے اہتمام سے

مطبع آگرہ اخبار میں چھاپی گئی

دفعہ دوم

قیمت عہ

سخن اک رمز ہے کشف اسرار معانی کا
ادب اک آئینہ ہے جلوہ گاہ لن ترانی کا

کہاں کی پارسی تازی کہ جا اردو بھی رخصت ہے
زمین شعر پر قبضہ ہے دور آسمانی کا

گل و بلبل کے افسانے نہیں دفتر ہیں حکمت کے
چھپا الفاظ کے اندر خزانہ ہے معانی کا

جو ڈھونڈو گے تو پاؤ گے جو سمجھو گے تو جانو گے
کہ ہم کو اک دفینہ مل گیا عہد کیانی کا

گل و بلبل میں یہ جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
خود بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

ہندوستان کی عام زبان اردو تسلیم کی جاتی ہے۔ گر ہندو صاحبوں نے ہندی کے رواج دینے میں بہت بڑی کوششوں سے کام لیا۔ حالانکہ خود ہندوؤں کا شایستہ اور مہذب گروہ اردو بولتا اور اردو لکھتا پڑھتا ہے۔ اور اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان نہیں بلکہ یہ سب قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگلش گورمنٹ نے سررشتہ تعلیم اور عدالتوں میں اردو اور ہندی دونوں کے رواج و تعلیم کو داخل کر دیا۔ جب ایسا ہوا تو ہندوؤں کی آنکھیں کھلیں اور ایک گردن کو دو رسیوں میں بندھا ہوا پایا۔ نفاق اور تعصب کے یہی نتائج ہیں جو ہندوستان کا ستیاناس کر رہے

آخر کار مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ہندو ہندی کی اشاعت میں سرگرم ہیں۔ اور ہندی اردو کو دبانا اور اُس کی فصاحتوں کو بگاڑنا چاہتی ہے تو اُردو کی حفاظت کا سامان کیا اور مسلمانوں کے اجلاس محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس دہلی سنہ ۱۹۰۳ء (زمانہ دربار شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ملکہ) میں ایک خاص کمیٹی اُردو کی حفاظتوں کو قرار پایا۔ اور مولانا شبلی نعمانی سابق پروفیسر عربی مدرسۃ العلوم علی گڑھ حال ناظم دینیات حیدر آباد اُس کے سیکرٹری قرار پائے اور ضروری علوم و فنون کی تدوین پر خیالات رجوع ہوئے ازاں جملہ یہ کتاب بھی توسیع ذخیرۂ معلومات اُردو کی غرض سے پیش کی جاتی ہے۔ اس کے دیکھنے سے بعض پُرانے خیالات کی نسبت فلسفیانہ جانچ کا موقع ملیگا اور مغربی علوم کے تعلیم یافتہ ایک حد تک اپنے مشرقی مذاق اور اُس مذاق کے اسباب و علل سے واقف ہوسکیں گے۔

نظم

مشرقی ادب

تباہ حال ہے ہندوستاں میں لٹریچر
پڑے اُجاڑ ہیں جو تھے ہرے بھرے گلشن
ہیں بلبلوں کی جگہ بینہ تتلیاں اُڑتی
ہیں نونہال چمن علم سے پھلے پھولے
ہر ایک باغ میں ہے اک نئی ہوا چلتی
نہ ہندوؤں میں نظر آئے بالمیک کوئی
نہیں ہے ایک بھی تلسی کا مثل بھاشا میں

بہار کا نہیں پاتے ہیں اس چمن میں گزر
ہوا نے جڑ سے اکھاڑے جو تھے قدیم شجر
نسیم صبح کے گھر میں ہے چل رہی صرصر
مگر مٹھاس کا پاتے نہیں پھلوں میں اثر
چمن میں پھول ہیں لیکن بہار ہے باہر
نہ ہم میں ہیں متنبّی و شیفتی و جعفر
نہ پارسی میں ہے خسرو کا دوسرا ہمسر

انیسؔ و غالب مرحوم کی جگہ کوئی
ہوئے نہ ملک میں افسوس دو زباں آور

ہے سنسکرت زمانے میں ہاں زبانوں کی
مگر ہے اب تو وہ بیکنٹھ باش سر تا سر

نہ ہم کو نحو و عروض سخن سے دلچسپی
نہ ہندوؤں کو توجہ نیا نے دنگل پر

نہ بولتے ہیں پپیہے صدائے دلکش سے
نہ قمریوں کے ترانوں میں وجد کا ہے اثر

کنول کے پھول کھلے ہیں مگر ہیں پژمردہ
کھڑا ہے حوض میں لیکن فسردہ نیلوفر

ہزار طرح کے پھل ہیں مگر مٹھاس نہیں
ہزار رنگ کے گل ہیں مگر نہیں گلِ تر

ہے بالمیک کی تصنیف قالبِ بیجاں
نہ پہونچے بام پہ اُس کے کمند اہلِ نظر

مصنفین میں بھاشا کے ہیں جو تلسی داس
ورق طلا کے ہیں اُنکے لکھے ہوئے تیتر

مگر بیان ہوئے جو استعارہ ہائے ادب
وہ میل کھائیں نہ انگلش مذاق سے یکسر

ادب سے پہلے تھا وابستہ دھرم کرم یہاں
نہ پاس آنے دے اُسکو جدید لٹریچر

گریجویٹ جو نکلے ہیں نیو فیشن کے
دلوں میں اُنکے نہیں اُس مذاق کا ہے اثر

اسی طرح سے مسلماں بھی ہو گئے ہیں عجیب
نہیں دماغوں میں ان کے قدیم کے جوہر

کہاں وہ لوگ جو اعجازِ خسروی سمجھیں
کہاں وہ فیضی و آزاد جیسے جان پرور

جو نغمہ سنج طرب تھیں وہ اڑ گئیں چڑیاں
جو نکتہ دانِ ادب تھے وہ اڑ گئے طائر

زباں میں حس ہی نہیں ہے تو ذائقہ کیسا
نہیں مشام تو پھر کیا شمامۂ عنبر

چمن وہی ہے مگر بلبلیں نہیں ویسی
سچے پڑے ہیں کہیں کیا یونہیں اُنکے پر

اثر نہ پوت میں موتی کا ہو سکے پیدا
نہ پائیں لوہے میں فولاد کے کبھی جوہر

ہر ایک چوب نہ تاثیر میں بنے صندل
ہر ایک پھول میں آئے گلاب کا نہ اثر

دل و دماغ نہ باقی رہے ہوں جب اگلے
تو اُن سے کام بتاؤ وہ ہو سکے کیونکر

جو پہلے فضل و ادب کے تھے مقصد اعظم
وہ اب ہیں خانہ برانداز صاحبان ہنر

نہ سلطنت کو ہمارے ادب کی کچھ پروا
نہ سلطنت کی صداؤں کے ہم سخن گستر

نہ کچھ خدا سے علاقہ نہ دیوی دیوتا سے — نہ آج کام کے اوتار ہیں نہ پیغمبر
نہ راج نیتی میں اپنی زباں کا کچھ حصہ — نہ ہم فرائض اعلیٰ ہیں صاحب دفتر
نہ شمع حسن ازل سے لگی ہماری لو — نہ ہیں مناظر حسن کمال پیش نظر

اُردو

میں اب دکھاتا ہوں اُردو کی حالتیں تم کو — جو عام طور سے دیکھے ہر ایک اہل نظر
ہے ہندوؤں کے لئے کنیاں یہ کلجگ کی — ہماری قوم کو دوشیزہ حامل مختصر
اصول السنہ اس پر ہیں حجت ناطق — کہ اس زبان کے نہ ہو دوسری زبان ہمسر
حروف سب سے زیادہ ملے ہیں اُردو کو — بنیں کثیر سے الفاظ نسبتاً اکثر
زیادہ لفظوں سے جملے زیادہ ہوں پیدا — اُسی قدر ہوں تکلم میں وسعتیں ظاہر
ہر ایک بیج ہے اس کی زمیں میں کھپ جاتا — ہر ایک تخم ہو نشو و نما سے بار آور
جو دیکھئے عربی سنسکرت بھاشا کو — تو اُن کو غیر کی صحبت سے سب گریز و حذر
مگر نہیں اسے کچھ دوش اُن کے ملنے سے — نہ یہ تعصب مذہب کی عادتاً خوگر
نہ ایک نثر ہی مجموعۂ تکلم ہے — ہے جا بجا سخن عام نظم کا دفتر
بڑے بڑے ادبا اس کے ناقل معنی — بڑے بڑے حکما اس کے قابل جوہر
جو کام سہل ہے اُس کو وہ غیر کو مشکل — جو کام غیر کو آسان وہ اسکو آساں تر
ذرا بتاؤ تو ہندی ہیں لکھ کے دکھیں تو — ہوں کلیات نہیں جس کے یہ وسعتیں مضمر
نہ ایک جملے سے پیدا ہوں اسقدر معنی — نہ یوں تلفظ الفاظ ہو سخن گستر
عرب کے لفظ عجم کے زباں کی یہ حالت — زبان انگلش و بھاشا کی ناقل دفتر
نہ لکھ سکیں اُسے اہل مقدمہ ایسا — نہ پڑھ سکیں اُسے اہل معاملہ فر فر
یہی زبان ہے زمانے کے ساتھ چل سکتی — نہیں ہے جس میں تعصب کا نام کو عنصر

نہیں ہے واسطہ خاص اُسکو مذہب سے
انہیں وجوہ سے اغیار چاہتے ہیں یہ
کوئی زباں نہیں اس کے سوا یہاں ایسی
یہی زبان ہے انگلش کے ساتھ چل سکتی
سوائے اس کے علوم و فنونِ انگلش کا
کبھی نہ نفع ہو ہندی کو دورِ انگلش میں

نہ ایک مذہب و ملت کی یہ ہوئی خوگر
کہ نوچ ڈالئے کلیوں کو تا نہ نکلیں پر
جو سب زبانوں میں ملجائے جیسے شیر و شکر
اسی زبان میں ہو ہر زباں سخن گستر
کوئی زباں نہ کرے اس سے ترجمہ بہتر
مگر لڑائی سے اُردو کا ہو ضرر ضرر

غضب ہے ملک اگر اشہری نہ قدر کرے
کرے گا ظلم جو اُس پر وہ ہے ستم خود پر

ایشیائی شاعری

آج کل ہندوستان میں عام جلسوں میں دو متضاد خیال کے طبیعت دار پائے جاتے ہیں - ایک اولڈ فیشن کے شیفتہ - دوسرے نیو فیشن کے فریفتہ - اولڈ فیشن والے سنسکرت بھاشا - عربی - فارسی - اردو کی شاعری اور ادب پر لوٹ ہیں - اور نیو فیشن والے مغربی مذاق کے سامنے مشرقی خیالات اور مقالات کو ہیچ کہہ رہے ہیں لیکن اولڈ فیشن والے بغیر صورت دکھائے حسن کی داد چاہتے ہیں اور نیو فیشن والے بغیر صورت دیکھے بیداد کر رہے ہیں اور دونوں کا یہ خیال کہ ہمارے مذاق نے جو فیصلہ کر دیا وہ صحیح ہے غلط ہے سہ

میں نے کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط   اُس نے کہا کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

اور یہ غلطی عام طور سے ایک کو دوسرے کے مذاق کی لاعلمی اور غیر جنس کی صحبت اور ہمجنس کی نا آشنائی سے پیدا ہوئی ہے اور نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس جہل اور لاعلمی سے تمام مشرقی علوم اور فنون جو سیکڑوں ہزاروں برس

سرمایۂ فخر و ناز رہے اور اب بھی وہ ایک ضروری استفادہ اور قدردانی کے لایق ہیں روشنی سے اندھیرے میں چھپتے جاتے ہیں۔

میں اس وقت سب کو چھوڑ کر **ایشیائی شاعری** کا ذکر کرتا ہوں۔ ہیئت قدیمہ میں کرۂ ارض کو سات حصوں پر تقسیم کیا گیا تھا اور ہر حصہ ایک اقلیم سمجھا جاتا تھا۔ جیسے اقلیم فارس۔ اقلیم ہند۔ اقلیم چین وغیرہ۔ پھر جب خدا نے یورپ کے عیسائی تاجداروں کو صاحب علم و اقبال کیا تو اُنہوں نے تثلیث کے خیال سے زمین کو تین حصوں پر تقسیم کیا۔ اُنکے نام یہ ہیں۔ یورپ۔ ایشیہ۔ افریقہ۔ پھر حکیم کلمبس نے امریکہ دریافت کی لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جو حصہ ایشیا کی نام سے موسوم ہے جسمیں ایران ہندوستان چین اور اُنکے ملحقات اور پایۂ تخت دوسرے بڑے بڑے قدیمی نامی شہر و بلاد پائے جاتے ہیں۔ یہ ہمیشہ دنیا کے جسم میں دل کا مقام سمجھا گیا ہے اور جیسے دل سے تمام جسم کو شرائین اور اوردہ کے ذریعہ سے خون پہونچتا اور وہ جسم و اعضا کی پرورش کرتا ہے ویسے ہی اس حصہ زمین سے تمام دنیا فیضیاب رہی ہے۔ اب یورپ نے خود کو تمام کرۂ ارض کے جسم پر بطور دماغ کے نمایاں کیا ہے۔ اور گو دنیا کا دماغ طرح طرح کے علوم و فنون کی روشنیوں سے روشن ہو رہا ہو لیکن دنیا کا دل روز بروز مرتا جاتا ہے۔ اور یورپ کا دماغ ایشیا کے خون سے پرورش پا رہا ہے۔ مگر ایشیا کو اپنے بدل یا تحلل کی فکر نہیں۔

اور یورپ کی دماغی تعلیم ایشیا کے دل کو زندہ کرنیوالی نہیں ہوسکتی جبتک کہ ایشیا اپنی روحانی تعلیم سے اپنے دل کو زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کی فکر نہ کرے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ایشیا نے اپنے زمانہ ترقی میں دل اور دماغ دونوں کی زندگی کے سامان فراہم کئے تھے اور یورپ نے ابھی تک صرف دماغ کو روشن کیا ہے۔ ایشیا کا مذاق فلاسفی کا ایک دفتر اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے یہ ہمارے

افہام کا قصور ہے جو ہم ہر بات کی تہ کو نہ دریافت کریں۔ یورپ ہماری بات بات سے فائدہ اُٹھا رہا ہے اور ہم کو اپنی دنیا میں کسی بات سے رہنمائی نہیں ہوتی۔ اور ہمارا مذاق دوسروں کے کہنے سے اپنے گھر کی ہر چیز کو بُرا کہنے بُرا جاننے اور دوسروں کی ہر بات کو اچھا کہنے اور اچھا جاننے کا خوگر بن رہا ہے۔ جب ہم کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہماری کوئی چیز کیوں بُری ہے اور دوسروں کی کوئی چیز کیوں اچھی ہے اور دوسرے ہماری ہر چیز کو کیوں بُرا کہتے اور اپنی ہر چیز کو کیوں اچھا بتاتے ہیں تو ہم اپنے آپکو اس تاریکی سے ایک نئی اور قابل قدر روشنی میں پائیں گے۔ اے خدا تو ہم کو اس تاریکی سے نکال اور زندہ دلی اور روشن دماغی کے سامان مہیا کر۔ ؎

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ابھی تو ہم ایک ایسے شیش محل میں بیٹھے ہیں جس کی زمین سہو کی اور جسکی چھت محو کی اور جسکے در و دیوار لہو کے ہیں۔ اور مغربی آفتاب کی جلوہ گری نے ہمارے مکان کو چاروں طرف سے شش رنگا بنا دیا ہے جو ہمکو محو حیرت بنائے ہوئے ہے۔ یہ حالت دیکھکر مغربی علوم ہم پر ہنس رہے ہیں کہ ہم کیسے عجائب المخلوقات ہیں جو اس نادیدہ طور سے اُس شیش محل کو دیکھ رہے ہیں۔ اور مشرقی علوم ہم پر رو رہے ہیں کہ ہم سینکڑوں برس تمہاری ترقیوں کا ذریعہ ثابت ہوئے مگر تم نے ہم کو ایسا پست کیا کہ اب ہم کو قد آدم بلند ہونا مشکل ہو رہا ہے۔

نیو فیشن کی تمام سوسائٹی میں ایشیا کی شاعری کو قابل قدر سمجھنے والا شاید کوئی ہو لیکن بے دیکھے اس کو بُرا کہنے والے اور بے سمجھے اُس کو ناپسند کرنیوالے بہت ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کس زبان میں شاعری کی ایجاد کب ہوئی اور کیوں ہوئی اور ایشیائی شاعری کا موضوع کیا ہے اور کس زبان کی شاعری نے کہانتک اپنے ملکی یا یا قومی مذاق کی عام دلچسپیوں کا نمونہ پیش کیا ہے۔

ایشیائی شاعری کے سبجکٹ پر مکمل بحث کرنا برسوں کی دیدہ ریزی کا کام ہے اور اس فن کے متعلق ایک کتب خانہ سامنے ہونا چاہیئے مجکو دوسرے افکار و مشاغل سے اس کام کی بہت تھوڑی فرصت ہے اور کتبخانہ کیسا معمولی کتابیں بھی میرے سامنے نہیں۔ تاہم جو لکھا گیا ہے وہ عام خیال کو اکثر مقاصد سے مطلع ہونیکا ذریعہ ثابت ہوگا۔

شعر کیا ہے

من کیستم آں سالک کونین مسیرم | کز بخشش جوہر قدس است خمیرم
آنجاکہ ادب نغمہ طراز است شمیمم | وآنجاکہ ہنر جلوہ فروش است بصیرم
در خانہ مجنوں کہ خراب است غبارم | در حجلۂ لیلی کہ بہشت است عبیرم
آں چشمہ قربم کہ ز لب تشنگی دمے | جبریل در آید بحرم گاہ ضمیرم

عربی میں شعر بال کو کہتے ہیں۔ اور بالوں سے شکل انسانی کی بہت بڑی زینت ہے۔ اگر عورت مرد بال منڈوا ڈالیں تو اس سے کوئی نقصان نہیں لیکن نیچرل خوبصورتی کی بالوں سے وہ زینت ہے جو انکا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ روئے زیبا کیلئے زلف و گیسو کا ہونا ضرور ہے۔ جناب شیخ کا حسن محاسن سے ہے اور بال خود ہی سرمایۂ زینت نہیں بلکہ حسن صورت کے لئے بھی ذریعہ ناز ہیں اسی طرح شاعری کے نہونے سے لٹریچر کا نقصان نہیں لیکن جو ذاتی خوبصورتی اُس کو حاصل ہے اور اُسکے سبب سے دوسرے اعضاء و اجزا کو رعنائی کا حصہ پہنچنا اور اُنکو حسین بنانا ہے وہ حاصل نہیں ہوسکتا یہ مثال اچھی شاعری کے لئے ہے اور گندہ شاعری کی مثال اُن بالوں سے دی جاسکتی ہے جو مکروہ طور سے دیکھے جاتے ہیں اور وہ رکھنے کے قابل نہیں۔ اب غالباً آپ سمجھ گئے ہونگے کہ زلف جاناں کے بغیر چہرہ کی زینت نہیں اور آپ کسی سر منڈے معشوق کا دیکھنا پسند نہ کریں گے اگرچہ وہ کیسا ہی حسین ہو۔ وہی

مفہوم شعر کا ہے - ادب بجائے خود ایک حُسن کا پتلا ہے اور شاعری اُسکے روئے زیبا کے لئے زلف جاناں کی طرح بجائے خود حسن اور اُس حُسن کو زینت دینے والی ہے - اور مفہوم کلام میں شعر ایک سانچہ ہے جس میں خیال کی مختلف چیزیں مناسب وزن و مقدار سے ڈھلتی ہیں اور شاعری وہ صنعتِ خاص ہے جو اُن چیزوں کے ڈھالنے کو ایجاد کی گئی اور شاعر اُن چیزوں کا ڈھالنے والا ہے - شاعری اشعار اور ادب کے دیوانخانہ عام کو بطور فرنیچر کے ہے - اور جیساکہ ہر مکان کے لئے فرنیچر کا ہونا خوش آیند اور اُس مکان کی زینت کا سبب ہے ویسے ہی دیوانخانہ ادب کیلئے شاعری کا فرنیچر خوش آیند اور اُس مکان کو زینت دینے والا ہے - اور اصطلاح سخن میں دو مصراع موزوں کو شعر کہتے ہیں اور اس کی مثال ابرو سے اس لئے دی جاتی ہے کہ معشوق کے چہرہ پر بھویں بطور دو مصراع یا ایک شعر کے ہیں -

شاعری کی ابتدا

ڈھونڈنے والے وہاں پائیں گے صورت میری
مدد لے طاقت گفتار کہ کچھ کہنا ہے

عالم قدس کے اُس پار ہے خلوت میری
پوچھتے ہیں دم آخر وہ حقیقت میری

اس بات کا ایک ٹھیک اور واقعی فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ سب سے پہلے کس زبان کو نظم کلام کی عزت حاصل ہوئی - کیونکہ ایشیا اور ایشیا کے ساتھ جن ممالک کو دلچسپی اور وابستگی رہی اُن میں ہر زبان کی ترقی افزا اسامانوں میں ادب کے ساتھ نظم کا پتہ ملتا ہے -

سنسکرت جو ہزاروں برس پہلے سرتاج عالم تھی اور اب بھی اُسکو ام الالسنہ ہونیکا فخر حاصل ہے اُس میں نہایت اعلیٰ درجہ کی شاعری کے دفتر کے دفتر مرتب اور مدون ہو چکے ہیں - عرفان حقیقی کا نہایت عالی شان کام اور فلسفہ اور حکمت کا اشراقی اور الہامی چارج شاعری کو سپرد تھا - اور مذہبی خدمتیں اور بادشاہی

دربار کے بہتیرے کام شاعری سے متعلق تھے چنانچہ اب بھی پرانے اشلوکوں سے اُنکا پتہ ملتا ہے۔ مجھ سے آخر اٹھارویں صدی کے مشہور دیانند سرستی نے بیان کیا کہ شنسکرت بجائے خود ایسی زبان ہے جو دیوتاؤں کی زبان کہے جانیکے سزاوار خیال کیجا سکتی ہے اور اُسکے اصول نے اُسکو ہمیشہ اختلاط عام سے بچائے رکھا اُس پر شنسکرت کی شاعری نے وہ مرتبہ حاصل کیا کہ وہ آپ ہی اپنا نظیر کہا جا سکتا ہے جیسے آفتاب اور آفتاب کی روشنی۔ پھول اور پھول کی خوشبو۔ شنسکرت کی شاعری کا حُسن اور اُسکی بہتایت کسی زبان کو نصیب نہیں۔ یہ کہکر اُنھوں نے کہا کہ اب کوئی شنسکرت کا ہمہ داں نہیں ہر بایں ہمہ اُس کے اشعار کی خوبیاں جس قدر سمجھی جا سکتی ہیں اُن کی کیفیت کو وہی شخص جان سکتا ہے جو اُس کا ماہر ہو۔ اور اُس کے بہت سے لطائف دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے ادا نہیں ہو سکتے۔ اور نہ وہ لفظی ترجمہ میں سما سکتے ہیں۔ پھر اُنھوں نے ایک نقشہ دکھایا جس کے خانوں میں کہیں ایک ایک حرف کہیں ایک ایک لفظ کہیں اُسکے زیر زبر پھیلے ہوئے تھے اور مجھ سے کہا کہ شنسکرت کی شاعری میں ایک صنعت تھی جس کا ترجمہ گورکھ دھندا کیا جا سکتا ہے اور جیسے کسی گھڑی یا باجہ کے کیل پُرزے علحدہ کر دیں اور اُنکا جاننے والا اُن کو ملا دے ویسے ہی اس صنعت کے الفاظ و معانی کا جمع کرنا ہر پنڈت کا کام نہ ہو سکتا تھا اس صنعت میں ایک مطلب تو وہ ہوتا تھا جو لکھنے والے کا حقیقی مقصد ہے۔ دوسرے سیکڑوں معنی ایسے پیدا ہوتے تھے جو دوسرے مطالب سے واسطہ رکھتے ہیں یہ ایک ایسی چھپی ہوئی صنعت تھی جس کے تہہ در تہہ پردوں میں اصل مطلب کا کھلنا اگر محال نہیں تو بہت مشکل ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نقشہ میں کامرودیس کے راجہ نے راجہ دکن کی لڑکی کا سوال کیا ہے اور در پردہ اپنے کمال علمی کو دکھایا ہے اور اصل مطلب کی بات کو دوسروں کی آگاہی سے بچایا ہے۔ راجہ کا نام سورج سین اور لڑکی کا نام گنگا پتی تھا اس لئے اُس کے

ایک شعر کا مطلب یہ تھا کہ سورج کو گنگا میں نہانے کی اجازت ہو۔ سرستی جی کہتی تھے
کہ اس نقشہ کو مختلف طور سے پڑھتے اور مختلف معنی کہنے سے ان چودہ شعروں میں
چودہ سو لطائف اور رموز لفظی و معنوی کا انحصار کیا گیا ہے۔ ہرچند اس زمانہ کی مذاق
میں ہم کو یہ صنعت ایک طرح کا آفت جان معلوم ہوتی ہو بلکہ اُس کے ذکر سے ہمارے
دل میں ایک خاص اُلجھن کا احساس معلوم ہوتا ہوا پایا جائے لیکن اُس سے زبان
سنسکرت کی بہتایت اور پچھلے مذاق کے دقیق ادب کا پتہ ملتا ہے مسلمانوں میں
شاہنشاہ جلال الدین اکبر کے وزیر و ندیم علامہ ابوالفیض فیضی کو سنسکرت میں خاص
قابلیت حاصل تھی۔

بھاشا

سنسکرت کے بعد بھاشا نے ہندوستان میں دخل کیا۔ بعض لوگ بھاشا کو
سنسکرت کی لڑکی خیال کریں گے لیکن اس لڑکی میں ماں کے اوصاف نہیں وہ
درباری تھی تو یہ بازاری ہے۔ بھاشا میں نظم اور شاعری کا ایسا چرچا ہوا کہ کوئی علم اور کوئی
فن ایسا باقی نہ رہا ہوگا جس کو نظم میں نہ لایا گیا ہو۔ بھاشا کا چورن بیچنے والا ہے وہ بھی
بھاشا کی نظم میں چورن بیچنے کی آوازیں لگا رہا ہے۔ بھاشا نے نظم کو ہر بات کی دلنشینی
کا ذریعہ سمجھا الٰہیات۔ ریاضیات۔ بیدک۔ کیمسٹری۔ تاریخ۔ حُسن و عشق وغیرہ وغیرہ
سب کو نظم کا لباس پہنایا اور اُن کو آسانی سے جلد یاد ہونے کے لئے مختصر اور دلچسپ بنایا گیا
بچّے سے لیکر جوان اور جوان سے لیکر بوڑھے تک ہر طبیعت اور ہر درجہ کی حسب حال
اُس کو وسعت دی گئی اور ہر ایک کے مذاق کا لحاظ رکھا گیا۔ اور نظم کو ہر درجہ اور مذاق
کے مصرف میں خرچ کیا گیا چنانچہ اب بھی اس کا پتہ سیکڑوں کتابوں سے ملسکتا ہی
نظم میں ایسے ایسے کھیل داخل کئے گئے جن سے اذہان میں تیزی اور بلند پروازی
کی طاقت کو ترقی ہو اور باتوں باتوں میں بڑے بڑے استعارات معنوی کے سمجھنے کی

عادت پڑے جس کا پتہ اب بھی بھاشا کے اکثر دوہروں پہیلیوں انل کہہ مکرنیوں سے ملتا ہے
بھاشا میں یہ علمی کھیل بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی بھاشا کی تصنیف
اور ترجمہ اور شاعری سے دلچسپی حاصل کی اور قابل قدر حصہ پایا ہے۔ ملک محمد
جائسی کا نام پدماوت کی تصنیف سے خاص و عام کی زبان پر ہے۔ بلگرام میں اکثر
بزرگ ایسے گزرے ہیں جو بھاشا کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور اب بھی بہتیرے
مسلمانوں کو بھاشا کے ساتھ خاص دلچسپی ہے۔ پہلے زمانہ میں برج کی بھاشا کو خاص
قسم کی عزت کا فخر حاصل تھا جیسے شیراز و اصفہان کی فارسی اور دلّی اور لکھنؤ کی
اردو لیکن اس زمانہ میں بھاشا اس باریک بینی سے آزاد ہوگئی ہے تاہم جن مقامات
میں بھاشا کا چرچا زیادہ ہے یا جس سوسائٹی میں اس پر خاص توجہ کی جاتی ہے اسکو
عام مذاق میں زیادہ پسندیدگی سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر اب بھاشا میں بھی ایک نیا تغیر ہوا
ہے۔ اور عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی اور ہندوستان کے دوسرے حصص کی زبانوں نے
اس میں داخل ہو کر اس کو ایک نئی بھاشا بنالیا ہے جو سو دو سو برس پہلے کی بھاشا سے
دوسری قسم کا ہے۔ اور ہندو طبائع کو جو مذہبی مقامات کے رہنے والے یا اپنی پرانی زبان
سے لگاؤ رکھنے والے ہیں بھاشا کی اصلاح و ترقی کے متعلق ایک جدید خیال پیدا
ہوا ہے جس سے ہندو طبائع کو لگاؤ ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں مگر وہ اس سبق
کو بہت دور چھوڑ آئے ہیں اور اب وہاں تک پہنچنا آسان بات نہیں

عربی

عربی عرب کی زبان ہے جس کو افریقہ کے ساتھ خاص تعلق ہے لیکن اس میں کچھ
شک نہیں کہ عرب سے زیادہ عجم نے عربی کو ترقی دینے اور مختلف زبانوں کے علوم کو عربی میں
داخل کرنیکی کوشش کی ہے۔ عربی پر ایشیا کا خاص حق ہے جس کا پتہ مختلف تصنیفات

سے ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام سے پہلے ایام جاہلیت عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا جو کچھ پڑھتے تھے وہ زبانی پڑھتے تھے اسی طرح سیکڑوں ہزاروں اشعار زبانی یاد رکھتے تھے اور قبائل عرب کی خلقی فصاحت وبلاغت اپنی رہائش اور جائے پیدائش کی حسب حال شاعر بنا لیا کرتی تھی۔ دنیا میں عرب کے سامنے کوئی قوم خلقی شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اب بھی جو خالص عرب ہیں انکا بچہ بچہ مذاق شاعری کو فطرۃً اپنے ساتھ لایا ہوا پایا جاتا ہے اور یہ بات ایسی واضح ہو چکی ہے کہ اس پر بعض بڑے بڑے نامی پروفیسروں اور یورپ کے نامور محققوں نے شاعری کے مذاق کو حسب استعداد قابلیت داخل فطرت تسلیم کرنیکے لئے قبائل عرب کو دلیل میں پیش کیا ہے اور عربی میں شاعری کا جو رتبہ ہے وہ ظاہر ہے عربی زبان میں کوئی ادیب ہی نہیں کہا جا سکتا جبتک اقسام شاعری کا ماہر کامل نہو۔ ہر قسم بلاغت کے لئے شاعری کا جاننا لازمات ادب میں سے ہے۔ شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی سابق پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ۔ اسلامی کتبخانوں کی تحقیق کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ عرب میں شعر و شاعری اور انساب کا چرچا اگرچہ نہایت قدیم زمانہ سے تھا لیکن تحریر کا مطلق رواج نہ تھا سب سے پہلے جس نے اس فن کی بنیاد ڈالی وہ قبیلہ طے کے تین شخص تھے۔ مرامر۔ اسلم۔ عامر ان لوگوں نے ایک جا جمع ہو کر حرفوں کی شکل اور وضع قرار دی اور حروف ہجا اس ترتیب سے مقرر کئے جیسے سریانی زبان میں تھے۔ ان لوگوں سے حیرۃ والوں نے سیکھا۔ حیرۃ والوں کا ایک شاگرد جس کا نام بشیر بن ولید تھا اور دومۃ الجندل کا رئیس تھا کسی کام سے مکہ گیا وہاں ابوسفیان امیر معاویہ کے باپ سے ملاقات ہوئی ابوسفیان نے اُس سے اس فن کے سیکھنے کی درخواست کی چنانچہ ابوسفیان اور ابوقیس بن عبد مناف دو شخص اُس کے شاگرد ہوئے اور چونکہ یہ دونوں تجارت کے ذریعہ سے طائف آیا جایا کرتے تھے۔ اس لئے طائف میں بھی تحریر کا رواج ہو گیا۔

بشیر نے مصر اور شام میں بھی بہت لوگوں کو شاگرد کیا اور رفتہ رفتہ اکثر قبائل میں تحریر کا رواج ہو گیا یہاں تک کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو صرف ایک قبیلۂ قریش میں سترہ شخص صاحب قلم موجود تھے جن میں یہ حضرات بھی تھے۔ عمر بن خطابؓ۔ عثمان بن عفانؓ۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ پھر عورتوں میں بھی اس فن کا رواج ہو چلا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے گھرانے میں شفا بنت عبداللہ اور حضرت حفصہؓ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ مدینہ منورہ میں بھی اسلام سے پہلے تحریر کا رواج تھا جس کے موجد یہود تھے۔ یہ تمام تفصیل فتوح البلدان بلاذری کے خاتمہ میں مذکور ہے۔ مولانا شبلی کی اس تحقیقات پر رسالہ اصلاح عظیم آباد میں ایک عالمانہ اور محققانہ ریویو کیا گیا ہے جس میں اُس سے پہلے فن کتابت کے موجود ہونیکو ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن ہم کو یہاں اس بحث میں پڑنے سے کوئی سروکار نہیں۔ ہندوستان میں بھی عربی کے بڑے بڑے ادیب پیدا ہو چکے ہیں جو تمام دنیا میں لاثانی تسلیم کئے گئے ہیں۔ یا اُنکی شاعری اور ادب میں کوئی ایسی نرالی بات پیدا ہوئی ہے جو دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ جیسے ابو الفیض فیضی جسنے قرآن کی تفسیر سواطع الالہام بے نقط لکھکر دنیا کو دنگ کر دیا۔ یا میر غلام علی آزاد بلگرامی جن کا دیوان سبحۃ المرجان عربی کی زمین پر فارسی اور بھاشا کی گلکاریوں سے ایک نرالی چیز بن گیا ہے جس کو تمام عرب بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور وہ حلاوت کسی عرب کے دیوان میں نہیں پائی جاتی۔ یا سید محمد مرتضٰی زبیدی جو قصبۂ مردم خیز بلگرام کا فخر جو تاج العروس شرح قاموس کے مصنف ہیں۔ ان کی نسبت اخبار ہلال مصری لکھتا ہے کہ یہ ہندی فاضل جس کی تصنیف کا چرچا تمام عرب۔ روم شام۔ بلکہ تمام جہان میں ہو رہا ہے اس کا ہم پلہ کوئی فاضل آج روئے زمین پر نہیں ملتا۔ سید مرتضٰی ۱۱۶۴ھ میں ہندوستان سے بعزم حج روانہ ہوئے پھر موضع زبید علاقہ یمن میں سکونت اختیار کی اور وہیں شادی ہوئی۔ علاقہ موصوف کے سیکڑوں شاگرد مصر و اسکندریہ و استنبول اور نواح یمن میں پائے جاتے ہیں اور خود سلطان

عبدالحمید خان اول نے ۱۱۹۴ھ میں حدیث کی سند آپ سے حاصل کی اور ڈیڑھ سو قرش یومیہ آپ کو خزانہ سلطانی سے مقرر ہو گئے تھے۔ آپ کی تصنیفات سے ۴۸ کتابیں تاج العروس کے علاوہ ہیں۔ ان کتابوں میں سے حضرت امام غزالی کی احیاء العلوم کی شرح نہایت عجیب اور لاثانی ہے جو شہر فاس علاقہ مغرب اقصیٰ میں ۱۳ جلدوں کے اندر چھپی ہے۔ ۱۲۰۵ھ میں آپ نے بمقام مصر مرض طاعون میں انتقال فرمایا اناللہ وانا الیہ راجعون **عربی** ہندوستان میں بجھتا ہوا چراغ ہے اور ہمارا میلان روز کم ہوتا جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کو خدا نے عقل سلیم عطا فرمائی ہے وہ اس امر کا اندازہ کرلیں کہ ہمارے تعلقات ممالک عرب اور عربی زبان سے کیسے قریب ہوتی جاتے ہیں اس لئے ہم کو اس چراغ میں تیل ڈالکر چراغ افروزی کا خیال رکھنا ضرور ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے گھر کا چراغ بجھا کر روشنی سے اندھیرے میں پڑ جائیں۔

یورپ پر عربی کا حق

محققین یورپ نے خود اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ ابتدا میں یورپ نے تمام علوم عرب سے حاصل کیے پھر ان کو جلا اور ترقی دی۔ ان میں فرنچ نے کسب علوم میں دوسروں پر سبقت کی۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں جب امرا و شاہان یورپ مسلمان بادشاہوں اور امیروں سے ملاقی ہوئے تو اس وقت یوروپین امرا کو اہل عرب کے ادبا، شعرا، مورخین، اطبا، حکما کے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی ترقیات اور انکے اخلاق و ادب کو دیکھکر کسب علوم کا شوق ہوا چنانچہ اہل فرانس کی پہلی تاریخ لوئیس نہم کے عہد میں جو ۱۲۷۰ء میں فوت ہوا فرنچ مذاق اور عربی ترتیب پر لکھی گئی۔ پھر بادشاہ لوئیس یازدہم کے عہد میں جو ۱۴۸۳ء میں فوت ہوا شہر مان پیلی میں ایک طبی مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی اور اندلس سے عربی تعلیم یافتہ استاد بلائے گئے۔

سنہ ۱۳۲۳ء میں شہر طور نور کی سرگرم انجمن کے ممبروں نے ایک علمی کالج کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کالج کے طالب علموں کے لئے وظیفے مقرر کئے اور امتحان میں عمدہ لیاقت ظاہر کرنیوالے طلبہ کو انعامات تقسیم کرنیکا ایک عجیب اصول اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ سونے چاندی کے پھول بنائے جاتے تھے اعلیٰ درجہ کا طلائی پھول فی البدیہہ عربی شعر کہنے والے طالب علموں کو دیا جاتا تھا یا اُن ہونہار طالب علموں کو جو عربی کی طرز پر فرنچ زبان میں اشعار تصنیف کر سکیں۔ اور قوم کے حوصلہ بڑھانے والے لوگ کالج کے دروازہ پر سونے چاندی کے پھول پتیوں کے گلدستے لٹکاتے تھے تاکہ امتحان میں جو طالبعلم جس درجہ میں پاس ہو اُسکو اُسی درجہ کا گلدستہ دیا جائے۔ نکتہ رس طالبعلم جنکی طبیعتوں میں شعر کا مادّہ ہوتا تھا امتحان کے کمرہ میں بیٹھکر عجیب عجیب طویل قصائد بنا لیتے تھے اور انجمن میں منظور ہونیکے بعد وہ گلدستے حسب لیاقت اُنکو دیئے جاتے تھے۔ دو صدیوں تک یہ کالج طرز پر چلتا رہا۔ اور اندلس کے مسلمانوں کے فیوض و برکات نے ان میں شاعری اور ادب کی ایسی روح پھونکی کہ فرنچ عورتیں بھی اس علمی مشغلہ میں حصہ لینے لگیں چنانچہ پندرھویں صدی کے آخر میں طور نور کی ایک دولتمند عورت نے کئی لاکھ پونڈ اس کالج کو یونیورسٹی بنانے اور انعامات کے دائرہ کو وسیع کرنیکے لئے عنایت کئے اسی روز سے اس علمی یونیورسٹی کی ثروت و فراخ دستی بڑھ گئی اور دور دور کے شعرا کی رغبت ان گرانبہا انعامات کے حاصل کرنے کی جانب زیادہ ہوئی۔ اہل فرانس نے خالص فرنچ زبان کو عربی طرز پر لاکر قصائد تیار کرانے کے لئے اعلان دیئے اس وقت کے شعرا نے فرنچ زبان میں عربی مضامین کو ڈھالنا شروع کیا اور فرنچ زبان جو پہلے چنداں دلچسپ نہ تھی عربی مضامین کے جواہر زرنگار سے مزین ہو کر ایسی دلکش اور دلچسپ ہو گئی کہ ابتک یورپ کی دوسری زبانوں سے باعتبار ادب کے معتبر اور باعزت مانی جاتی ہے۔ اور یہ انجمن اُس وقت سے اب تک چلی آتی ہے

اس وقت اُس کا نام پھولوں کی ایکادمی کر کے مشہور ہے اس انجمن میں چالیس ممبر ہوتے ہیں۔ اور یہ ایکادمی اپنے فرائض مقررہ کی رو سے قواعد زبان فرنچ اور فنون ادب کی محافظ سمجھی جاتی ہے۔ ہر ایک سال کے اختتام پر اُس انجمن کا جلسۂ تقسیم انعامات ہوا کرتا ہے۔ جس میں مستحقین کو انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ اس انجمن نے نو قسم کے پھول انعامات کے لئے مقرر کئے ہیں جو سونے چاندی کے بنائے جاتے ہیں اور بعض کو مرصع کیا جاتا ہے شعر و قصائد کے انعامات کا انتظام علاحدہ طرز پر ہے اور نثر و خطب کے انعامات کا اہتمام علٰحدہ ڈھنگ پر۔

اخبار الہلال مصری نے ایک آرٹیکل میں بیان کیا ہے کہ فرنچ لوگوں نے عرب سے علم قوافی۔ عروض۔ غزل۔ آداب النظم والنثر و قصاید کو حاصل کیا قصص و حکایات ضرب الامثال اور تواریخ علم اخلاق اور علمی کورسوں کی تدوین کا طریقہ سب عرب سے سیکھے۔ یہ سب کچھ کتاب تواریخ الادب الفرنسادی میں مفصل مذکور ہے۔

پارسی

سرزمین ایران جو ہزاروں برس کیانی۔ ساسانی۔ پیشدادی شاہنشاہوں کی تخت گاہ رہی وہاں دور اول کی زبان مطلق فارسی تھی جس میں دوسری زبان کی شرکت نہ تھی۔ پارسیوں کے صحف قدیم اوستا ژند۔ پاژند۔ دساتیر اُس زماں کا یادگار ہیں۔ اب اُس زبان کی کتابیں بہت نایاب ہیں۔ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں آکسفورڈ لندن کے عالی شان کتب خانہ میں بعض پارینہ نسخوں کا پتہ ملتا ہے۔ پھر دوسرے دور کی زبان پہلوی کہی گئی۔ اور اُس نے بھی اپنے آپ کو دوسری زبان کی میل سے ایک علی حدہ تک پاک و صاف رکھا۔ لیکن دور اول کی زبان کے مقابلہ میں یہ دوسری چیز بن گئی اور ایک دوسرا مذاق اس میں شریک ہوگیا۔ اور طرز ادا

کا بھی رنگ بدلا۔ اس دور کی زبان کا بہتر سے بہتر نمونہ شاہنامہ ہے۔ فارسی میں
شاہنامہ ایسی کتاب ہے جس کو ادبائے عرب نے قرآن العجم کے نام سے یاد کیا ہے
اور اُس کو شاعری کا بے مثل نمونہ ہونے کی عزت حاصل ہے۔ اُس کے بعد زبان کا
تیسرا دور شروع ہوا۔ جو سعدی و حافظ سے شروع ہوتا ہے۔ جو پانسو برس تک ادب آموز
دنیا رہا۔ پھر فتح علی شاہ بادشاہ اور فتح علی خاں صبا ملک الشعرا ایران کے زمانہ سے
ایران کی پارسی ہندوستان کی اُردو بننے لگی۔ اور انگریزی روسی جرمنی فرنچ وغیرہ زبانوں
کے الفاظ اور مصطلحات کی شرکت اور آمیزش سے موجودہ فارسی ایک طرفہ معجون نظر آئیگی
جو پچھلی نوشدارو کے خلاف ہوگی۔ اور اس دور اخیر میں بہترین نمونہ حکیم قاآنی کے کلیات
اور ناصر الدین شاہ کجکلاہ ایران کے دو مجلد سفر ناموں سے دریافت کیا جاسکتا ہے اور
فارسی میں جو نمایاں کام شاعری نے کیا وہ اُس کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔
آور ہمارے علم عروض کی بعض کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ فارسی میں بہرام نے پہلا
شعر کہا اور وہ یہ ہے۔

منم آں شیر دماں و منم آں شیر یلہ	نام بہرام مرا و پدرت بو جبلہ

بعض کہتے ہیں کہ رودگی سمرقندی پہلا شاعر ہوا۔ اور یہ دونوں روایتیں قریب قریب
سب کتابوں میں نظر پڑتی ہیں اور ایک دوسرے سے نقل کرتا چلا جارہا ہے لیکن
دری اور پہلوی کا محقق کبھی اس قول کو باور نہ کرے گا کہ بہرام سے پہلے فارس میں شاعری
نہ تھی۔ بہرام تیسری صدی عیسوی کے اخیر میں تھا اور رودگی عروج اسلام کے زمانہ کا
شاعر ہے۔ شاید یہ ہو کہ بہرام فارس نہاد اور عرب نژاد ہے۔ اور اسی لئے اُس کے
اس شعر سے بھی عربی کنیت کا پتہ ملتا ہے۔ اُس نے پہلے پہل یہ شعر کہا ہو۔ اور اُسکو
پہلا شعر سمجھا گیا ہو۔ اور اسی طرح مسلمانوں میں سب سے پہلے رودگی کو شاعری کا تمغہ
حاصل ہوا ہو۔ نہ یہ کہ بہرام اور رودگی سے پہلے شاعری کا وجود ہی نہ تھا۔ دراں حالیکہ

لغت قدیم میں غزل اور قصیدہ کی جگہ چہارمہ اور چگامہ کے الفاظ موجود ہیں۔ فارسی زبان میں شاعری سے بڑے بڑے کام لئے گئے۔ اور شاعری کو بادشاہوں کی خلوت اور جلوت اور رزم و بزم سے خاص تعلق رہا۔ اور شاعروں کی اعلیٰ سے اعلیٰ عزت کی گئی جس پر وزرار کو رشک آتا تھا ہے۔ شاعر کو ملک الشعرار کا خطاب نہ صرف دربار میں بار پانے بلکہ بادشاہ کے قریب بیٹھنے کا مستحق بنا دیتا تھا۔ اور سمجھا جاتا تھا کہ جیسے بادشاہ اپنے ملک کا بادشاہ ہے ویسے ہی یہ اپنی قلمرو کے بادشاہ ہیں اس لئے دو بادشاہوں کے پاس بیٹھنے میں مضائقہ نہونا چاہئے۔ ہندوستان میں شاہ عالم بادشاہ نے مہاراجہ سیندھیا کو فرزند خاص کا خطاب اس لئے عنایت فرمایا تھا کہ یہ خطاب اُن کو بیٹھنے کا مستحق بنا دے۔ قصہ مختصر شاہ محمود کے زمانہ میں فارسی نے ہندوستان پر خاص اثر ڈالا اور ایران اور غزنی سے نکل کر دتی۔ لاہور۔ کشمیر اور وہاں سے چلتے چلتے سارے ہندوستان میں کم و بیش اپنا دخل اور رسوخ پیدا کر لیا۔ اور ہندوستان میں ہندوؤں کے ہزاروں خاندان فارسی لکھنے پڑھنے میں ممتاز نظر آنے لگے۔ بلکہ بہتیرے ہندوؤں نے خود کو فارسی میں صاحب تصنیف اور مستند ثابت کیا۔ اور فارسی کی شاعری بتدریج تعلیم یافتہ پارٹی کا ایک مذاقِ خاص بن گئی۔

اِس دور کے قابلِ قدر زمانہ میں جبکہ شیراز کو سعدی اور حافظ جیسے سخن طرازوں سے بلند نامی حاصل تھی دلّی کو امیر خسرو دہلوی کی سخن آرائی نے دوسرا شیراز بنا رکھا تھا خسرو کے کمالات شاعری اور ادب پر ریویو کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتا۔

میرے نزدیک اس رتبہ کا شخص نہ صرف دلی بلکہ تمام دنیا میں بھی دوسرا نظر نہیں آتا جس کی تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلاواسطہ مبدرِ فیاض سے مضمون پا رہا اور بلا ذریعہ لوحِ محفوظ کو دیکھ رہا اور اُس کی نقل اُتار رہا ہے۔ جو اُس کا اور صرف اُس کا حصہ ہے۔ جس کو خسرو کے معیارِ کمال کے دیکھنے اور میرے بیان کے تصدیق

کی خواہش ہو وہ مطبع اودھ اخبار سے اعجاز خسروی منگا کر دیکھے اور اُس سے خسرو کے لاثانی فضل وکمال کا اندازہ کرے ۔ اور نیز اس امر کا اندازہ کرے کہ اعلیٰ درجہ کی سوسائٹی میں کس قسم کے قابلانہ اور فاضلانہ مذاق سے دلچسپی حاصل کی جاتی تھی۔ اور ادب کے پہلوان کس کس ترکیب سے دماغ کے روشن کرنے اور خیال کی بلند پروازی کے لئے کیا کیا ورزشیں کیا کرتے تھے ۔ بہر حال ہندوستان میں پانسو برس تک فارسی لٹریچر اور فارسی شاعری کا چرچا رہا۔

اب بھی ہر حصہ ملک کو اُس سے کچھ نہ کچھ لگاؤ اور دلچسپی باقی ہے اگرچہ اُس کو یونیورسٹی سے نکل جانے میں غیر متوقع نقصان پہنچا ہے۔ حالانکہ ہمارے تعلقات اُن ملکوں اور قوموں سے جہاں فارسی بولی جاتی ہے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہمکو فارسی کا بھلا دینا ایک ایسا عجیب سبق ہے جو ہم کو یاد رکھنا چاہئے۔

کلکتہ میں جو عالی شان جلسہ محامڈن اینگلو اورینٹیل ایجوکیشنل کانفرنس کا ہوا تھا اُس میں مولانا شبلی صاحب نعمانی نے نہایت محققانہ اور فاضلانہ طور سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ فارسی میں ہر قسم کے علوم کا ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے اور ہماری قومی لیاقتوں کو فارسی کے ساتھ ایسی وابستگی ہے جو اُس سے علاحدہ نہیں کی جا سکتی۔ اور فارسی کے نہ جاننے سے ہمارا ادب بالکل خراب ہو جا سکتا ہے۔

فارسی شاعری اور یورپ

شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی کے نواسے اور ہمارے لائق دوست مولوی شرف الحق صاحب مددگار بندوبست حیدرآباد کے بیٹے مشرف الحق صاحب حصل اللہ مرامہ شہر ایڈنبرا اسکاٹلنڈ سے لکھتے ہیں کہ یورپ میں اس وقت دو لاکھ سے زیادہ مشرقی قدیم کتابیں مختلف کتب خانوں میں نہایت احتیاط اور آراستگی

سے رکھی ہیں سب سے نایاب مجموعہ پیرس میں ہے جہاں اسلامی کتب خانۂ اسپین
اور افریقہ کے بھی نایاب نسخے مل سکتے ہیں - فلارنس روم - وآنا مبونخ پیٹرزبرگ میں زیادہ
تر مشرقی مجموعہ فراہم ہے - میں اس وقت انگلستان کے مجموعوں کا مختصر حال لکھنا
چاہتا ہوں - اگر ہمارے تعلیمی مرکز علی گڑھ کو اپنا قومی کتب خانہ مرتب کرنا ہو تو ایسے نسخوں
کو مہیا کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے - یا کم سے کم ممبران اُردوئے معلی سے امید کی جاتی ہے
کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں - تاکہ جو حصہ جا بجا پڑا پڑا باقی رہ گیا ہے وہ ایک
جگہ فراہم ہو کر ہمارے کام آئے -

اکسفورڈ کی لائبریری میں پروفیسر ساحا کی مرتب کی ہوئی فہرست کے موافق ۱۸۸۹ء تک
فارسی کی قلمی دو ہزار اڑتیس کتابیں داخل ہوئیں - میں اُن کے عالی دماغ مصنفوں اُنکے
زریں قلم کاتبوں اُن کے مضامین کی بلندیوں اُن کے نقش ونگار کی باریکیوں اُنکے کاغذ کی
چکنائی جلدوں کی پائداری روشنائی کی صفائی وغیرہ کے بیان سے قاصر ہوں اس میں
نظم کی مختصر تشریح یہ ہے -

فردوسی اور مقلدین ۲۸ - شیخ سنائی ۱۱ - انوری ۱۶ - خاقانی ۲۲ - نظامی ۳۵ -
فریدالدین عطار ۱۵ - جلال الدین رومی ۴۲ - سعدی ۲۸ - امیر خسرو ۲۷ - حافظ ۳۶ - شاہی ۸ - جامی ۴۳ - ہاتفی ۲۱ -
ہلالی ۸ - فیضی ۶ - کلیمی ۱۱ - صائب ۲۷ - مختلف نظم گلدستے اور نظم ونثر کے خلاصے - (۴۱)
تصوف کی نظم ونثر (۶۱) مسجع نثر - توشیح نظم - رقعات - فرمانوں کا مجموعہ - مقفیات انشار -
چیستاں - خوش خط قطعے وغیرہ - (۸۴) فارسی اور ہندوستانی باتصویر کتابیں - (۱۲)
زردشتی لٹریچر زبان زند پازند پہلوی - پارسی (۲۸) نظم کی مختلف کتابیں مختلف مذاق
اور مختلف علوم وفنون ہیں (۷۵)

اکسفورڈ کے بعد کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں تین ہزار سے زیادہ اورنٹیل
قلمی کتابیں ہیں ۱۸۹۶ء کی فہرست میں مندرج ہیں جس فہرست کو مسٹر برن نے بہت بڑی

محنت سے تیار کیا ہے اور یہ مشرق کا لاثانی تحفہ ہے یہ کتابیں ڈیوک آف بکنگھم اور سر ولیم میور اور دوسرے علم دوست اصحاب اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں اور ڈائرکٹروں کے ذریعہ سے پہونچی ہیں۔ ان میں بعض کتابیں اس اہتمام اور فیاضی سے لکھوائی گئی ہیں اور اُن کے نقش و نگار میں اتنی دولت خرچ ہوئی ہوگی کہ اب اُس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔

لندن کے مشہور و معروف برٹش میوزیم میں مختلف اقسام کی ساٹھ ہزار قلمی کتابیں جمع ہو چکی ہیں جن میں دس ہزار طلائی ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ ایسا شاندار مجموعہ دنیا کے اور کسی عجائب خانہ میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ روزانہ ہزاروں آدمیوں کی نگاہیں اُن پر پڑتی ہیں۔ یہ کتابیں جن کی تعریف میں زبان قاصر ہے شیشے کے خانوں میں بند میزوں پر نہایت صفائی سے رکھی ہوئی ہیں۔ برٹش میوزیم کے سوا اور نفیس قلمی کتابیں اس ملک کے خانگی ہاتھوں میں بھی بیشمار ہیں جو مشرقی ممالک اور ٹرکی مصر مراکو وغیرہ سے کوڑیوں کے مول لی گئی ہیں۔ ڈبلن کا عجائب خانہ میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن وہاں بھی مشرقی کتابیں ضرور ہوں گی۔ خصوصاً عربی کی انڈیا آفس لندن میں مشرقی کتابیں بے شمار جمع ہیں۔ انڈیا آفس میں کم سے کم تین ہزار سات سو اڑتالیس کتابیں سنسکرت زبان میں پرانے لٹریچر کے متعلق لکھی ہوئی جمع ہیں۔ انڈیا آفس کے عربی فارسی مجموعہ کی فہرست میری نظر سے نہیں گزری مگر برٹش میوزیم میں فارسی کتابیں اتنی ہیں جن کی فہرست مسٹر چارلس ریو نے ۱۸۷۹ء میں مرتب کی۔ چار موٹی موٹی جلدوں میں چھپوائی ہے۔ ان چاروں جلدوں کا علیگڈھ میں ہونا ضرور ہے۔ لندن میوزیم میں مشرف الحق صاحب نے ایک حصہ اُن کتابوں کے نامو نکا بتایا ہے جن پر خود مصنفوں کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں یا خود اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور دوسرا حصہ فارسی کی اُن کتابوں کا ہے جس کو طلائی نقاشی اور طرح طرح

کی تزئین وافشاں نے ہر صفحہ کو گلدستہ یا پھولا ہوا چمن زار بنا دیا ہے اور وہ کتابیں مصنفین ذیل کی جانب منسوب ہیں جن کے نام نامی سے ایشیا کی دنیا کو ہمیشہ فخر رہے گا۔

ملا کاتبی یحییٰ شبستاری۔ حیدر شیرازی۔ ناصر الدین حیدر شیرازی۔ سنائی۔ حمید اللہ قزوینی ابوالقاسم فردوسی۔ شہاب الدین سہروردی۔ ملا جامی۔ عبدالرزاق سمرقندی۔ نصیر الدین طوسی اسدی رازی۔ شمس الحسن اشیر۔ سعدی شیرازی۔ شاہی۔ شرف الدین علی یزدی۔ ضیا برنی۔ کمال الدین ابوالعطار المتخلص خواجوے کرمانی۔ مرزا اسکندر۔ نظامی۔ انوری۔ سوزنی تقی شرف الدین شفروح۔ فخر الدین عراقی۔ نصیر باجائی۔ کسائی۔ حمزہ کوچک فتوحی۔ رشید الدین وطواط۔ فخر الدین عراقی۔ فرخی۔ عسجدی۔ اسدی طوسی۔ منوچہری۔ عمر خیام۔ ناصر خسرو۔ ناصر عراقی سلمان ساوجی۔ کمال خجندی۔ ملا اوحدی۔ سید جلال الدین عضود جلال الدین عتیقی۔ جلال الدین خوافی جلال طبیب۔ حافظ نزاری کوہستانی۔ عماد فقیہ۔ خسرو دہلوی۔ ناصر بخاری۔ ابن یمین۔ بساطی۔ خفی علائی۔ غیاث کرمانی۔ اوحدی۔ حسین بن علی واعظ کاشفی۔ محمد امین ابوالحسین قزوینی۔ ظہیر فاریابی۔

الغرض ہمارا جو ذخیرہ چاروں طرف سے سمٹ کر یورپ کی سیرگاہ بن رہا ہے۔ کم سے کم اس کی فہرستیں تو ہمارے پاس ہونا چاہئیں۔ ہم نے شاعری کے متعلق ایک مختصر اقتباس کا ذکر کیا ہے۔ اگر ہمارے کتب خانہ میں یہ مجموعہ فراہم ہو تو ہماری شاعری اور ادب کیلئے نہایت قابل قدر نمونہ ہونیکے لئے بکار آمد ہو سکتا ہے۔ جو جدید شاعری اور ادب میں ایک نہایت عمدہ روشنی پیدا کر سکتا ہے اور قوم کے منتشر خیالات کو ایک خاص معیار کی جانب متوجہ کر کے موضوع سخن کا راستہ دکھا سکتا ہے۔

مسلمان اور شاعری

آغاز اسلام سے کچھ پہلے کتابت کا دستور ہوا جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس سے

بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اشعار وقصائد جو عرب کی تمدن اور معاشرت کی اصلی تصویر تھے اور جو اب تک زبانی روایت ہوتے چلے آتے تھے قلمبند ہونے لگے۔ اور اُن کی حفاظت کا بڑا ذریعہ نکل آیا۔ چنانچہ سات مشہور قصیدے جو معلقات کے نام سے مشہور ہیں۔ آب زرسے لکھے گئے اور کعبے پر آویزاں کئے گئے پھر یہ دستور ہو گیا کہ جو کوئی اعلیٰ درجہ کا قصیدہ لکھتا وہ اپنی شہرت اور اظہار کمال کو دروازۂ کعبہ پر جا کر لٹکا دیتا اور بڑے بڑے شائق اسکی پڑھنے اور سُننے کو جمع ہو جاتے۔ پھر جب اسلام کی اشاعت ہوئی تو دو قسم کی شاعری تھی ایک وہ جس میں بتوں کی تعریف اور تمجید بیان کی جاتی تھی دوسرے وہ جس میں ترانۂ توحید اور پند و نصائح اور شجاعت و سخاوت وغیرہ کے ذکر ہوتے تھے۔ پہلی قسم کی شاعری کو اسلام نے منع کیا اور دوسری کو جائز رکھا۔ چنانچہ خود حضرت علی نے شعر کہے اور اب آپکا دیوان موجود ہے۔ اور خود آنحضرت صلعم نے شعر سُنے اور شاعری کی تعظیم کو اپنی ردائے مبارک بچھائی ہے اور ایسے شعروں کی تعریف فرمائی ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ قرآن میں شاعری سے روکا گیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ خدا نے شاعری سے منع نہیں کیا بلکہ اپنے پیغمبر کی نسبت ارشاد فرمایا ہے کہ شاعری اُس کے لائق نہیں اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ ایک ایسے جلیل القدر پیغمبر کے لئے جو بلا واسطہ لوح محفوظ کا دیکھنے والا اور مبدء فیاض سے تعلق رکھنے والا ہو۔ شاعری کے موضوعات اور تخیلات سزاوار نہیں ہو سکتے اور شاعری کا درجہ پیغمبری کے درجہ کے ہمسر یا اُس سے برتر نہیں مانا جا سکتا اور جو شاعری قرآن میں ناپسند کی گئی وہ اُسی اول قسم کی شاعری ہے جس سے شرک جلی کا اعلان ہوتا ہے۔ ورنہ دوسری قسم کی شاعری کے پسندیدہ ہونے میں شک نہیں ٥

بشنو از انصاف اگر مقبلی	شعر بود حجت روشن دلی
شعر کہ اصحاب نبی گفتہ اند	چوں در و یاقوت گہر سفتہ اند
شعر علیؓ گفت و حسینؓ و حسنؓ	کعبؓ انس گفت و اویس قرن

شعر کہ حسان عرب گفتہ است	سید کونین پذیرفتہ است

شعر کی تعریف میں حضرت امیر خسرو دہلویؒ کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں۔

آنکہ نامِ شعر غالب می شود بر نامِ علم	حجتِ عقلی بتو گویم اگر فرماں بود
ہر چہ تکرارش کنی آدم بود اُستادِ آں	انچہ تصنیفے است اُستاد ایزد سبحاں بود
پس چرا بر دانشے کز آدمی آموختی	نایدآں غالب کہ تعلیمِ وے از یزداں بود
علم کز تکرار حاصل شد چو آب در خم است	کز وے از دہ دلو بالا بر کشی نقصاں بود
لیک طبعِ شاعراں چشمہ ہست زاینده کز اد	گر کشی صد دلو بیروں آب صد چنداں بود

ایک گوئیے سے اور حضرت امیر خسرو سے بحث آپڑی۔ بادشاہی دربار کا گویا اصول ادب سے واقف مختلف علوم کا ماہر۔ کہنے لگا موسیقی کو علم حکمت میں شمار کیا گیا ہے اور موسیقی دلوں پر خاص اثر ڈالنے کا ذریعہ ہے۔ امیر خسرو نے کہا کہ یہ سچ ہے لیکن شعر خاص حکمت ہے اور موسیقی کو شعر کی ضرورت ہے مگر شعر کو موسیقی کی ضرورت نہیں اُسکے لطائف بلا واسطہ موسیقی دل پر اثر کرتے ہیں۔ خلفائے بنی عباسیہ میں خالد ابن یزید بن معاویہ ادیب اور شاعر تھا۔ اور اُس نے اشعار عرب کا ایک بڑا سرمایہ جمع کیا تھا۔ پھر روز بروز اُس کو ترقی ہوتی گئی اور خلفائے بن العباس کا زمانہ تو ادب اور شاعری کا معدن پایا جاتا ہے۔ پالیٹکس اور تمدن اور قدردانی اور تفنن کے لئے یہ زمانہ ایسا عجیب زمانہ تھا جو اب تک آپ ہی اپنا نظیر سمجھا جاتا ہے خلیفہ سُنی وزیر شیعہ۔ خلیفہ عربی الاصل۔ وزیر عجمی النسل۔ سارا دربار تمام دنیا کے مختلف مذاقوں سے ایسی عجیب معجون بن رہا تھا جو ہر دل کو فرحت اور ہر دماغ کو طاقت دینے والی ہو جسکو خلفائے عباسیہ میں سے ایک ماموں رشید کا حال دیکھنا ہو اور وزراء عباسیہ میں سے برامکہ کی لائف پڑھنا ہو وہ مولانا شبلی صاحب نعمانی سے المامون اور مولوی محمد عبدالرزاق صاحب کانپوری سے البرامکہ طلب کرکے جھونپڑے میں محلوں کا خواب دیکھے۔

اسپین کا عالی شان کتب خانہ جو مستنصر نے تیار کیا اُسکے متعلق مولانا شبلی مشہور

مورخ ابن خلدون اور ابن الابار کے حوالہ تصنیف سے لکھتے ہیں کہ صرف اشعار اور قصائد کے مجموعوں کی جو فہرست تیار کی گئی وہ آٹھ سو اسی صفحوں میں تھی۔ اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ اشعار و قصاید کی کتنی کتابیں ہونگی جن کی فہرست آٹھ سو اسی صفحوں میں لکھی گئی۔

آپ اُس زمانہ کے نقشہ پر یوں غور فرمائیں کہ ایک جانب اسپین میں سلطنت اسلامیہ کا گردوں فروش نقارہ بج رہا ہے۔ دوسری جانب بغداد میں سلاطین عباسیہ کی عالی شان نوبت کی آواز سے تمام دنیا گونج رہی ہے۔ بخارا میں سامانی حکومت کا زور ہے۔ شام میں خاندان بنو حمدان سلطنت کر رہا ہے۔ شیراز کو آل بویہ کی حکمرانی کا فخر ہے مصر کو فاطمین مصر نے دوسرا بغداد بنا رکھا ہے۔ عضد الدولہ کی سلطنت نہایت وسیع تھی اور اُس زمانہ میں سب سے زیادہ ممالک اُسی کے قبضہ اختیار میں تھے وہ شاہی تمدن کے علاوہ بہت بڑا شاعر بھی تھا۔ اور علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اس نے شیراز میں ایک عالی شان کتب خانہ قایم کیا تھا۔

سیف الدولہ تیغ اور قلم دونوں کا مالک تھا اور اس قدر علم دوست تھا کہ اُس کے دربار میں شعراء باکمال کی گنتی خلفائے عباسیہ کے دربار سے کم نہ تھی حکیم ابو نصر فاریابی اسی کے دربار کا وظیفہ خوار تھا جو علاوہ علوم حکمت کی شاعری کا بھی حکیم تھا۔

فاطمین مصر کو شاعری اور ادب سے جو شوق رہا اور اُنھوں نے جو لوگ اس فن کے جمع کیے اور جو سرمایہ بہم پہونچایا وہ اُن کا حصہ کہا جاتا ہے۔

محمد بن الحسین بغدادی نے ایک نہایت قابل قدر اور لاجواب کتب خانہ جمع کیا تھا۔ اس میں قدیم عرب کے اشعار و قصائد چمڑوں پر اور خراسانی اور مصری اور چینی کاغذ پر لکھے ہوئے بڑی احتیاط سے رکھے گئے تھے۔

بادشاہوں کے سوائے ہر امیر اور وزیر ادب اور شاعری کا شیفتہ پایا جاتا ہے۔ اسلامی دنیا میں سیکڑوں حکیم اور علامہ شاعر پائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے صوفیہ

مرتاض شاعری کے شیفتہ نظر آتے ہیں۔ کوئی اعلیٰ درجہ کا دربار قدر سخن سے خالی نظر نہیں آتا۔ اسی ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں نے سنسکرت بھاشا۔ عربی۔ فارسی کی تصنیفات شاعری کی جو قدر کی وہ اس زمانہ میں ہم کو خواب وخیال معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ مسلمان بادشاہوں کی فیاضی اور قدردانی کا اندازہ کرنا چاہیں تو میر غلام علی آزاد کی خزانہ عامرہ اٹھا کر دیکھیں جس میں صرف انہیں شاعروں کا حال لکھا ہے جن کو صلہ کلام سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس میں کسی شاعر کا روپیہ اشرفی سے تول دینا یا ہزاروں کی گنتی میں انعام پانا یہ تو ایک معمولی بات تھی امیر خسروؒ نے ایسا انعام بھی پایا ہے کہ وہ مع ہاتھی اور ہودج وعماری کے روپے سے تول دیئے گئے۔ اس طرح پر کہ انکو مع ہاتھی کشتی پر سوار کرا کر جس قدر کشتی اُس بوجھ سے پانی میں ڈوبی اُسی قدر روپیہ کشتی میں بھر کر اُن کو دیا گیا تھا۔ علیٰ ہذا البعض شعرار کو ایک ایک مطلع پر بائیس بائیس لاکھ روپیہ تک انعام کی نوبت پہنچ چکی ہے اور سنسکرت اور بھاشا و عربی نے جو صلات کلام اپنے اپنے زمانہ کے قدردانوں سے حاصل کئے انکا ذکر افسانہ نظر آتا ہے۔ آج یورپ میں بادشاہوں کی قدردانی کا یہ دستور نہیں لیکن کسی شاعر اور ناولسٹ کو پبلک اتنا دے نکلتی ہے جس کو وہ بخوبی اپنی جگر کاوی کا معقول معاوضہ سمجھ لیتا ہے۔ اُس کے مقابل ہندوستان کا یہ حال ہے کہ نہ آج کل کے رئیسوں اور امیروں کو یہ توفیق ہے اور نہ پبلک کی قدردانی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اسی لئے روز بروز ادب اور شاعری کا بازار سرد ہوتا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو شاعر ہونا ایک قسم کی بے عزتی اور اضاعت اوقات میں داخل ہے۔

عربی شاعری کا ذخیرہ

آج کل مغربی دنیا نے ہر علم وفن کے لئے ایک خاص فلسفۂ عقلی کو اُس کا دیباچہ بنایا ہے یہ علم یا فن کب ایجاد ہوا کس نے ایجاد کیا۔ کس غرض سے ایجاد کیا گیا۔ کیا اثر ڈالا۔ کیا نتائج پیدا ہوئے۔ قدیم اور جدید حالتوں میں کیا فرق اور کتنی ترقی اور کتنا تنزل ہوا۔ کس زمانہ میں کیا کیا

اصلاح ہوئی۔ کوئی بات متروک ہوئی توکیوں اور کسی بات میں نقص رہا توکیا سبب۔ اصلاح وترقی کے اسباب کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یورپ نے ایشیائی علوم میں فلسفۂ عقلی کی ایک نئی روشنی اضافہ کی ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ ایک عام فن تھا جو اجمالی واقعات کا دفتر ہوتا تھا۔ اب یورپ نے تاریخ کو فلسفۂ عقلی کی ایک عام شاہراہ بنا دیا ہے جس سے حکیمانہ طور سے کلیات عملی کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔

مولوی غلام الثقلین صاحب بی۔اے ناظم تعلیمات گلبرگہ شریف علاقہ حیدرآباد نے جو علی گڑھ کالج کے لایق گریجویٹ ہیں اصول تاریخ پر ایک نہایت قابل قدر مقدمہ لکھا ہے جو ہمارے مورخین کے عملدرآمد کو زیر نگاہ ہونا چاہیئے۔ یورپ نے سنسکرت بھاشا۔ عربی فارسی کے علوم وادب پر بھی فلسفیانہ نگاہ ڈالی ہے۔ جرمن نے سنسکرت اور بھاشا کو خاص طور پر دیکھا ہے۔ فرانس نے عربی اور فارسی پر خاص نگاہ ڈالی ہے۔ انگلستان میں بڑی بڑی کتابوں کو فلسفۂ عقلی سے جانچا گیا ہے اور من حیث المجموع ایشیا کا تمام بکارآمد ذخیرہ یورپ کے پیٹ میں دیکھا جاتا ہے اور چھاپے کی ایجاد نے اُس کو اور بھی ارزاں کر دیا ہے۔ عربی کے فن ادب میں پہلے ہمارے ہاں صرف مقامات حریری متنبی سبعہ معلّقہ درس میں داخل تھے اور بعض لوگ تیموری اور نفحۃ الیمن بھی پڑھتے تھے اور یہی ہمارا معمولی سرمایہ تھا اب شام مصر بیروت استنبول وغیرہ میں چھاپہ کے سبب سے اشعار عرب کا بے انتہا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ شعرائے جاہلیت میں سے امرار القیس۔ زہیر بن ابی سلمی۔ لبید بن ربیعہ العامری۔ نابغۂ ذبیانی۔ علقمۃ الفحل۔ عروۃ بن الورد۔ حاتم طائی اوس بن حجر خنسا۔ عنترہ بن شداد العبسی۔ طرفۃ بن عبد بکری حادرۃ کے دیوان چھپ گئے ہیں قبیلۂ ہذیل کے شعرا کا کلام ایک مجموعہ میں چھاپا گیا ہے۔ خلیفہ منصور عباسی نے خلیفہ مہدی کی تعلیم کے لئے اشعار عرب کا جو مجموعہ تیار کرایا تھا اور جس کو علامہ مفضل نے جمع کیا تھا چھپکر شایع ہو گیا ہے ۱۲۵ قصیدے جو مختارات اشعار العرب کہلاتے ہیں پورے چھپ گئے ہیں۔ جمہرۃ العرب شائع ہو چکا ہے اسلامی شعرا مستند میں خطیئہ عمر بن ابی ربیعہ۔ اخطل فرزدق۔

ابو محجن ثقفی کے دیوان چھپ گئے ہیں۔ اور زمانہ مابعد کے شعرا کا کلام تو نہایت کثرت سے شایع ہو چکا ہے۔ عباس بن الاحنف۔ صریع الغوانی۔ عبداللہ بن المعتز۔ ابو تمام۔ ابو عبادہ بحتری۔ ابوالعتاہیۃ۔ ابو فراس۔ ابو نواس کہ ان میں سے ہر ایک فن شعر کا امام تھا سب کے دیوان چھپ چکے ہیں۔ ان کے سوا ادب کی وہ کتابیں جن میں کثرت سے اشعار عرب مذکور ہیں۔ بکثرت شائع ہو چکی ہیں۔ (دیکھو مولانا شبلی کی کتاب رسائل) ہمارے ادبائے ہند میں میر غلام علی آزاد بلگرامی نے وہ کام کیا کہ دوسرے کسی سے نہیں ہوا۔ یعنی سنسکرت اور بھاشا کی تشبیہات اور استعارات کو عربی کی شاعری میں داخل کیا۔ آزاد بلگرامی کے دیوان کا نام سبحۃ المرجان ہے اور وہ بھی استنبول اور بیروت میں چھاپا گیا ہے۔

مطبع اودھ اخبار لکھنؤ نے فیضی کی تفسیر سواطع الالہام بے نقط چھاپکر احسان کیا ہے۔ سنسکرت کی شاعری تبرک کے طور پر باقی ہے۔ لیکن بھاشا کی لائبریری سینکڑوں کتابوں سے معمور نظر آتی ہے۔ فارسی میں سینکڑوں مثنویاں اور دیوان چھپ گئے ہیں اور سینکڑوں مثنویاں اور دیوان قلمی پائے جاتے ہیں۔ اور اب فارسی کے علاوہ اُردو میں ایک بڑا ذخیرہ ادب اور شاعری کا بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن اب تک ہماری شاعری یورپ کے فلسفۂ عقلی کے موافق فلاسفی کی میزان میں تولی اور فلاسفی کی کسوٹی پر جانچی نہیں گئی اور اس کی بڑی ضرورت ہے کہ فلسفۂ تاریخ کی طرح شاعری کی فلاسفی پر ایک نہایت گہری نظر ڈالی جائے اور شاعری کی ہر کتاب کو فلاسفی کی روشنی سے دیکھا جائے۔ اور ہماری شاعری کی کتابوں پر جو تقریظیں اور ریویو لکھے جائیں وہ مغربی اصول پر لکھے جائیں اور ہمارے فاضل مبصر بطور ایک جیالوجسٹ کے اس معدن کی گہرائی سے جواہر گرانمایہ نکالنے والے ہوں۔ خذ ما صفا ودع ما کدر۔

ہماری شاعری کا موضوع حقیقی

ہمارے یہاں موضوع شاعری پر کوئی مستقل کتاب نہیں بلکہ علم بیان اور عروض و قوافی

کے ذکر کے ساتھ کہیں اجمالاً اس کا بھی ذکر آپڑا ہے وہ بھی ایسا جس سے کوئی وسیع رہنمائی نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک شاعری کے تین اقنوم ہیں۔ خدا بادشاہ۔ حسن۔ اور جو انکے علاوہ ہے وہ انہیں کے تحت یا متعلقات میں سے ہے۔ جب ان تینوں کا ادب شناس ہو تب پورا شاعر مانا جا سکتا ہے۔

شاعری کی تثلیث

بادشاہ

خدا

حسن
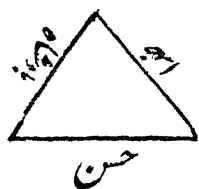
شاعری ادب کا پولٹیکل ڈپارٹمنٹ اور فلاسفی کا پرائیویٹ آفس ہے شاعری ایک معنوی پردہ ہے جس کے اندر خیال کا بازیگر روحانی کیفیتوں کا جسمانی صورتوں میں اور جسمانی حالتوں کا روحانی صورتوں میں تماشا دکھاتا رہتا ہے۔ جو حقیقت اور مجاز کے رنگوں سے رنگا گیا ہے۔ شاعری کا بڑا کمال حقیقت اور مجاز کی دو حالتوں کا تماشا ایک صورت میں دکھانے کا ہے۔ ایشیائی شاعر کا مذاق خاص یہ ہے کہ ایک بات کو پھیر کر دوسرے معنی پیدا کر دیئے جائیں اور راز کی بات علانیہ طور پر نہ کھلنے پائے۔ میخانے کو جائیں مگر کوئی دیکھ لے تو مسجد کی بات بنا سکیں ؎

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ

ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

شاعر کا بڑا تعلق شاعر کے جذبات وجدانی اور انوار الوہیت کے برکات روحانی سے ہے۔ اور ہماری روح کا روح اعظم کی جانب میلان ہمارے اوج خیال کے لیئے ایک لازمی اثر ہے۔ ؎

پانی [illegible] کو رواں ہے ۔۔۔ لو شعلہ کی سوئے آسماں ہے

اور چونکہ شاعر با[illegible] جذبات اور روحانی طاقت سے اپنے خیال کو بلند کرتا ہے اور وہ اوج خیال کے لئے انتہا کا درجہ ہے۔ اس لئے عالم بالا کی جانب شاعر کے روحانی جذبات کا ایک سلسلہ قایم ہونا لازمی ہو جاتا ہے اور اپنے اوج کمال کے مقام پر پہنچکر اُسکی روح جو دیکھتی اور سمجھتی ہے اُس کے لطائف اور حقایق کو شعر میں ادا کرتی ہے۔

نظم میں لطافت معنوی کی نثر سے زیادہ سمائی ہے جیسے نمک میں جو نمکینی ہے وہ مٹی میں نہیں۔ پھول کی خوشبو درخت میں نہیں پائی جاتی۔ اسی کے نفس بالطبع نظم کو نثر سے زیادہ پسند کرتا ہے موسیقی کی طرح نظم بھی دل پر اثر کرنیوالی چیز ہے اور ایشیا نے مقام معرفت میں ہزاروں برس جبہ فرسائی کی ہے تب یہ مذاق پیدا ہوا ہے ؎

سونا کیا حرام تو قسمت جگائی ہے ۔۔۔ جب خاک ہو گئے ہیں تو اکسیر پائی ہے

اور چونکہ شاعری حفظ اسرار کا خاص ظرف رکھتی ہے۔ اس لئے تمام ایشیائی زبانوں میں شاعری کو خاص طور سے اسرار حقیقت کا اہل سمجھا گیا ہے اعلیٰ درجہ کے ترانہ ہائے معرفت شاعری ہی کے پردہ میں ادا کئے جاتے ہیں۔ دیکھو مولانا روم کی مثنوی اور شمس تبریز اور حافظ شیراز کے دیوان ؎

جو ہر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا ۔۔۔ سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

شاعری اور تصوف

سنسکرت۔ عربی۔ فارسی میں ہزاروں برس پیشتر اس بات کا پتہ ملتا ہے کہ الٰہیات اور مذہب کو مختلف نوعیت سے شاعری کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ اور شاعری نے اُس کو اپنی دلچسپی کا خاص ذریعہ سمجھا ہے لیکن ہم کو بہت پُرانے زمانہ کی یاد کرنا منظور نہیں بلکہ ہم ہدایت اسلام سے اس بات کا کھوج لگانا چاہتے ہیں کہ مذہب کو شاعری سے اور شاعری کو مذہب سے

کیا تعلق رہا ہے۔ اور شاعری نے اُس میں کیا اثر پیدا کیا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مذہب کے احکام اور اسلامی دنیا کے واقعات صاف صاف لفظوں میں نظم کردیئے گئے جس میں زیادہ تر اصل مقصد کے ظاہر کرنے سے سروکار رہا۔ دوسرے وہ جو مذہب اسلام کو دوسرے پیرایہ میں لیجاکر اُس کو شاعری لباس پہنایا گیا اور شاعری کو اُس کا جولانگاہ بنایا گیا۔ جیسے تصوف کہ پہلے اسلام سے تصوف کی ایک مناسبت پیدا کی اور پھر شاعری کو تصوف کے کام میں خرچ کیا۔ کیونکہ شاعری کے لئے اس سے بہتر کوئی جادہ پیدا نہ ہوسکتا تھا۔ اور نہ تصوف شاعری سے بہتر دوسرا لباس پاسکتا تھا۔ تصوف کا مذاق ہر زبان میں پایا جاتا ہے اور ہارون رشید اور مامون رشید کا زمانہ ہر مذہب کے جمع کرنے میں لاثانی گزرا ہے۔ اس لئے سنسکرت اور فارسی نے عربی پر ایک جدید اثر نمایاں کیا اور شاعری میں تصوف کی چاشنی کو ہر مذہب نے قبولیت سے دیکھا۔ اور مسلمانوں نے بڑے بڑے شیوخ کبار کا رجحان تصوف کی جانب ہوگیا۔ یہاں تک کہ امام المتکلمین امام غزالی جیسے مقتدا نے تصوف کے روحانی مقاصد کو عام شریعت سے علحدہ کرکے اُن کو بہت بڑی تعظیم و تکریم سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ایسے مقاصد ہیں جن کے رموز و اسرار کو اہل راز ہی سمجھ سکتے ہیں اور اُن کا بیان کرنا دشوار ہے اس لئے کہ کوئی شخص جب تک اُس کیفیت سے متلذذ نہو وہ اُس کے لطائف کو جان نہیں سکتا اور جو جان جاتا ہے اُس سے اُس کا بیان نہیں ہوسکتا ہے جیسے پانی کی ٹھنڈک کہ بغیر ٹھنڈا پانی پینے کے معلوم نہیں ہوسکتی اور نہ اُس کا لطف کسی ایسے شخص کو جس نے پانی نہیں پیا بتایا جاسکتا ہے اور اسی لئے ہمارے معنی فہم سخن طراز کی معجز نگاری احیاء العلوم اور کیمیاے سعادت وغیرہ تصانیف کے اُن مقامات میں جو واردات قلبی اور کیفیات روحانی سے متعلق ہیں دیکھنے کے لائق ہیں جن کے لکھنے کے لئے دوسرا غزالی نظر نہیں آتا۔ اور وہ فقہی لٹریچر کا معجزہ ہیں

ہر بانگ نیاید ایں نوا را		ہر کوہ نتاید ایں صدا را ز	

اب میں اجمالاً تصوف کے بعض مقاصد کو جو ہماری شاعری سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ہماری شاعری کی روح رواں بن گئے ہیں۔ بیان کرتا ہوں پروفیسر اس اکسفورڈ لنڈن کہتے ہیں کہ اہل راز کا مذہب دنیا بھر میں ایک ہی سا ہے لیکن یہ بے تکلف بات مشکل سے جی ہاں کہدینے کے لایق ہوگی۔ میرے نزدیک اسلام میں جو کام متکلمین نے کیا اور جس وادی میں سرسید احمد خاں کی عمر گزری اُس کا لطف اہل استدلال سے پوچھا چاہیئے ایسے ہی اسلام کی صاف اور سیدھی باتوں کو جس ژرف نگاہی سے ارباب تصوف نے دیکھا اور جس لاثانی طریق سے مضمون اسلام کو بلند کیا وہ اُن کا حصہ ہے۔ اُس کام میں اُن کا بڑا کمال یہ ہوا کہ صوفیۂ متکلمین نے اسلام سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسلام کے ایک ایک لفظ کے دوسرے معنی کہکر اسلام کی ڈکشنری میں ایک عجیب اضافہ کیا۔ اور شریعت کو عین طریقت سمجھا یا طریقت کو حقیقت کا خاص موضوع بتایا۔ اور جیسے حکیموں نے دماغ کو مخزن حکمت بنایا تھا ویسے صوفیوں نے دل کو معدن طریقت خیال کیا۔ اور ساری طاقتیں دل کی زندگی میں صرف کیں۔ ہمارے موجودہ زمانہ کو یورپ اور ایشیا کے حکیموں کے اقوال اور علمار تصوف کے خیالات سے دل اور دماغ کے افعال پر ایک بہت بڑی چھان بین سے کام لینے کی ضرورت ہے اور دل کی تحقیق اُنکو ایشیا کے حکمار و اہل راز کے مجامیع و تصانیف سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے اور اب یہ خیال کسی کے بُجھتے ہوئے چراغ قبر سے بہت مشابہ ہے جس میں تیل نہیں اور اُس کی بتی بھی تمام ہوچکی ہے۔ لیکن اُس کی دھندلی روشنی بھی لعل شب چراغ سے کم قابل قدر نہیں۔ عام تصوف کا یہ مقصد بیان کیا جاسکتا ہے کہ اُس اصول پر کاربند ہونے سے ہماری روح اوج گرا ہوکر اُس روح اعظم میں جاکر ملجاتی جو تمام عالم کو سادھے ہوئے ہے۔ اُس کا اعتقاد ہے کہ خدا کا سب سے اچھا پتا اگر کہیں ملسکتا ہے تو انسان میں۔ اور اس پر حضرت علیؑ کے قول کو حجت لاتے ہیں من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ اور صوفی منطق اور استدلال کے بدلے مراقبے اور استغراق کے

مشاہدات اور تجلیات اور الہامات کو رہنما سمجھتے ہیں اور تجلیات اور الہامات کے حاصل کرنے کے لئے نفس کو مارنا۔ دنیاوی اور جسمانی خواہشوں کو دبانا لازم جانتے ہیں اور یہ حالتیں اُنکو ایک بیخودی کی کیفیت کا مزا دینے والی ہوتی ہیں۔ اہل مسلک کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری دوسرا عملی۔ نظری وہ جو حقیقت اشیاء تک پہونچنے کی سعی ہے اور عملی وہ جس کا مقصد اُس اکبر الاکابر سے وصال حقیقی ہونے کا ہے۔

اہل راز کے پیش نظر جو سب سے قوی خیال ہمیشہ موجود رہتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام چیزوں میں ایک ذات واحد جاری وساری ہے جو کچھ ہے وہی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ مذہب ہمہ اوست اور مذہب ہمہ ازاوست میں بہت بڑا فرق ہے۔ مذہب ہمہ اوست فرض کرلیتا ہے کہ انسان میں پہلے ہی سے الوہیت کے تمام خواص موجود ہیں جس پر منصور کا افسانہ طشت ازبام ہے۔ اور مذہب ہمہ ازاوست کا خیال اُس کے خلاف یہ ہے کہ انسان خدا سے جدا ہو گیا ہے۔ اسی لئے توحید ذات نہایت ضروری ہے۔

جو کتابیں تصوف پر یا تصوف کے مذاق میں لکھی گئیں اُن میں مولانا روم کی مثنوی اور شمس تبریز اور حافظ شیراز اور فریدالدین عطار اور ملا جامیؒ کے دواوین اور امام غزالی کے ملفوظات اور ہندوستان میں خواجہ میر درد اور میرزا مظہر جان جاناں اور امیر خسرو کے تبرکات اُس روئے زیبا کے لئے آئینہ کا کام دیتے ہیں اور ایک ہزار سال سے مسلمانوں کی تصنیف میں تصوف اور صوفیانہ مذاق کا کھلا ہوا پتا ملتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی کتابیں لکھی گئی ہوں جو ہمارے دیکھنے میں نہیں آئیں یا زمانے نے اُن کو برباد کردیا۔ چنانچہ ابوالخیر ابوسعید ۹۶۸ء میں پیدا ہوئے اور اُنہوں نے فارسی کی نظم ونثر دونوں میں تصوف کی کتابیں تصنیف کیں جو اکسفورڈ لندن کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

ابوسعید اور بوعلی سینا دونوں ہمعصر ہیں۔ بوعلی سینا کا قول ہے جو ابوسعید دیکھتا ہے۔ وہ میں جانتا ہوں۔ اور ابوسعید کہتے ہیں کہ جو بوعلی جانتا ہے میں دیکھتا ہوں۔ ابوسعید کے

اقوال میں ہے کہ جوں جوں انسان دنیا سے واقف ہوتا جاتا ہے خدا سے ناواقف ہوتا جاتا ہے
اور تصوف کا ایک مقولہ بھی ہے کہ العلم حجاب الاکبر - ابوسعید نے صوفیانہ نظم میں وہ خاص لطف
پیدا کیا جو شاید اُس سے پہلے کی تصنیف میں نہو۔ وہ عجیب عجیب استعاروں میں خدا کو معشوق
یا ساقی یا شمع سے اور انسان کو عاشق یا میخوار یا پروانہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ صوفیانہ کلام میں معشوق
حقیقی اور معشوق مجازی کی تمیز و تفریق کرنا دوسرے کے اندازہ فہم اور حسن ظن سے متعلق ہے۔
بعض وقت یہ تمیز نہیں ہوسکتی کہ وہ اخلاق کی باتیں کہہ رہا ہے۔ یا فلسفہ کی۔ تصوف کا عام
اصول یہ ہے کہ سب چیزیں خدا سے نکلیں اور خدا میں جا ملیں گی۔ جگہ جگہ یہ خیال ملتا ہے کہ
سب مذہب اور سارے دین ایک ابدی سورج کی کرنیں ہیں۔ سارے نبیوں نے اُسی
ایک ابدی حُسن اور ازلی حقیقت کے مسئلہ کو مختلف زبانوں میں بیان کیا ہے۔ صوفیوں کو
نہ صلہ کی پروا ہے نہ سزا کا خوف۔ بہشت اُن کے لئے حُسن ہے اور دوزخ خدا کا جلال۔
موتو قبل ان تموتو۔ اور فنافی اللہ اس کی تعلیم دو معمولی سبق ہیں۔

صوفیوں نے عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ سمجھا ہے۔ جو حسن ہم دنیا میں دیکھتے
ہیں صورت کا ہو کہ عادت کا کہ خیالات کا نور حقیقی کا ایک عکس ہے اور ریاضت اور نفس کشی
سے اُس نور کے ساتھ وصال ہونا ممکن ہے۔

تصوف کے تین درجہ ہیں پہلا درجہ شریعت ہے جس کا یہ مقصد ہے کہ طالب اسلامی
تعلیم حاصل کرے۔ پھر دوسرا درجہ طریقت ہے۔ صوفی یہاں آکر سمجھتا ہے کہ یہ جو ظاہر طریق
عبادت کے ہیں یہ صرف عوام کے لئے ہیں جن کو باطن سے آگاہی نہیں ہوتی تیسرا درجہ یقین
ہے یہاں پہنچکر صوفی خدا سے واصل ہو جاتا ہے جتنے بڑے بڑے شعرا ایران میں گزرے ہیں
اُن سب کا کلام متصوفانہ تھا۔ اس کی وجہ یا تو یہ کہ وہ واقعی صوفی تھے یا یہ کہ عادۃً اُن سے
اس قسم کا کلام صادر ہوتا تھا۔ یا شاعری کا سانچہ ہی اس ترکیب سے تیار کیا گیا کہ اُس میں چربی
کا فور اور دوسری پگھلنے والی جو چیز ڈالو وہ ہی صورت حاصل کر کے نکلے۔ مگر دوسرے قسم کے

شاعروں کا اصلی مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے ناقص کمال کو دوسروں سے چھپائیں اس لئے وہ ایسی اعلیٰ اور مقدس سوسائٹی میں مل بیٹھنے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ اور ایسی ملتی ہوئی آواز سے بات کرتے ہیں کہ معمولی طور سے پہچاننا مشکل ہو۔

صوفیوں کے نزدیک سب عالم خدا سے نکلا ہے اور پھر اسی میں جا ملے گا۔ جیسے سورج برابر شعاعیں پھینکتا اور پھر انہیں اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ نہایت بدیہی اور آسان مثال یہ ہے کہ خدا بمنزلہ سمندر کے ہے اور صوفی اس میں ایک قطرہ ہے۔ اور ایک قول بھی ہے کہ میں (یعنی خدا) پوشیدہ خزینہ تھا میں نے چاہا کہ ظاہر ہوں اس لئے میں نے اپنی صورت پر انسان کو پیدا کیا اس کلام سے صوفی عالم کو خدا کا مظہر ہونا خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام اجسام بطور آئینہ کے ہیں جن میں خدا کی جلوہ گری ہوتی رہتی ہے اور آئینے کے ٹوٹ جانے سے اس کو کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ اخیر میں صوفیوں کا خیال ظاہر کرنے کے لئے ملا جامی کی ایک نظم کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

عدم تھا اور خاموشی۔ اس میں ایک وجود تھا اکیلا۔ سوا اس کے کوئی اس کی خوبیاں دیکھنے والا نہ تھا آئینہ نہ تھا کہ اس کا حسن دکھاتا شانہ نہ تھا کہ اسکی زلفوں کو سلجھاتا۔ صبا نہ تھی جو گیسوؤں کو حرکت میں لاتی۔ سرمہ نہ تھا کہ آنکھوں کی مشاطگی کرتا۔ کسی نے وہ موہنی مورت نہ دیکھی تھی وہ خود ہی معشوق تھا خود ہی عاشق حسن تھا اور خلوت۔ لالہ کو دیکھو موسم بہار میں کیسا بن سنور کر کھڑا ہوتا ہے۔ گل کو دیکھو کیسا اترا اترا کر اپنا جوبن دکھاتا ہے۔ بس تو حسن ازل نے چاہا کہ ظہور ہو۔ فوراً ایک تجلی تھی کہ سارے عالم میں پھیل گئی۔ ذرہ ذرہ نے آئینہ ہو کر اس نور کا پرتو دکھایا۔ گل میں وہ حسن آیا کہ بلبل دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو گئے شمع کو وہ فروغ ہوا کہ پروانہ تصدق ہونے لگا۔ یہ سب کچھ نقاب ہے اور نقاب کے پیچھے ایک محبوب

کی محبت ہماری زندگی ہے۔ سب کچھ محبوب ہی ہے۔ تو ایک آئینہ ہے
جس میں وہ پرتوفگن ہوتا ہے۔ اور پھر تو وہ بھی نہیں بلکہ وہی صورت ہے
وہی آئینہ۔ ملا جامیؒ کی تحفۃ الاحرار میں اس مطلب کے متعلق یہ اشعار
درج ہیں ؎

شاہدِ خلوت گہِ غیب از نخست
بود پے جلوہ کمر کردہ چست

آئینہ عیب نما پیش داشت
جلوہ نمائی ہمہ با خویش داشت

ناظر و منظور ہمہ او بود و بس
غیر وے ایں عرصہ نہ پیمود کس

جملہ یکے بود و دوئی ہیچ نہ
دعوے مائی و توئی ہیچ نہ

گرچہ ہمی دید در اجمال ذات
حسن تفاصیل شیون و صفات

خواست کہ در آئینہ ہائے دگر
بر نظرِ خویش شود جلوہ گر

روضۂ جاں بخش جہاں آفرید
باغچۂ کون و مکاں آفرید

کرد ز ہر شاخ گل و برگ خار
جلوۂ او حسن دگر آشکار

سرو نشاں از قدِ رعناش داد
گل خبر از طلعتِ زیباش داد

سبزہ بگل غالیہ تر سرشت
پیش گل اوصاف خطِ او نوشت

فاختہ با طوق تمنائے سرو
زد نفس شوق ز بالائے سرو

بلبلِ نالندہ بدیدارِ گل
پردہ کشا گشت ز اسرارِ گل

کبکِ دری پا بحنا برزدہ
ز دلبر سبزہ قدم سر زدہ

قمری بنہادہ بہ شمشاد دل
سوخت بہ داغِ غم او شادِ دل

حسن ز ہر جا کہ زد القصہ سر
عشق شد از جائے دگر جلوہ گر

قالب و جاں اند بہم حسن و عشق
گوہر و کان اند بہم حسن و عشق

از ازل ایں ہر دو بہم بودہ اند
جز بہم ایں راہ نہ پیمودہ اند

نیست کشادِ ہمہ جز بندِ شاں	ہستیٔ ما ہست ز پیوندِ شاں

اردو کی خانقاہ میں ایسے ترانوں کی آوازیں نہیں گونجیتں۔ اور نہ اُردو کو تصوف کی خانقاہوں میں حال وقال کا اتفاق ہوا لیکن جن قلوب میں یہ آگ بھری ہوئی تھی اُن سے بغیر شعلہ افروزی کے نہ رہا گیا۔ چنانچہ منشی امیر احمد صاحب مینائی اور مولوی محمد محسن صاحب کاکوروی کے مقال میں اس قسم کی کافی چاشنی موجود ہے اور دوسرے دواوین بھی خالی نہیں ہیں دوسرے حصہ میں اُن کا اقتباس پیش کرونگا۔ یہاں جناب محسن کے دو تین شعر اُن کی مثنوی تجلی صبح سے نقل کرتا ہوں جس سے کلام کی فصاحت معلوم ہو اور شاعری کا فرقہ تصوف صوفیانہ رنگ میں شرابور نظر آئے۔ ؎

جو صبح الست کو چلی تھی	عالم میں وہی ہوا ہے چلتی
ہنگامۂ لا الہ ہر سو	توحید ہے مستِ نغمۂ ہو
آغوش حدوث میں قدم ہے	گم نور وجود میں عدم ہے

بادشاہ

خدا کے بعد اُسی سلطنت کا چرباشاہی دربار میں نظر آتا ہے اس لئے ہر زبان میں بادشاہ کے لئے ایسے مصطلحات مقرر ہیں جن سے بادشاہ اور خدا میں ایک نسبت خاص پائی جاتی ہے۔ جیسے عربی میں ظل اللہ۔ اُردو میں خدا کا سایہ۔ انگریزی میں آسمان کا نور۔ ہندی میں خدا کا مظہر وغیرہ وغیرہ اور بادشاہ کا دربار خدا کی سرکار کا ایک دوسرا خاکا چربا عکس بنالیا گیا ہے اور اُس کی درگاہ اقسام ادب کا مرجع ہے اس لئے اُس کے تمام لوازم کو نظم کے ساتھ خصوصیت معنوی ہے اور پالٹیکس کے تمام اسرار جو شاعری پردوں میں ادا ہو سکتے ہیں وہ اس اخفا و احتیاط سے نثر میں ادا نہیں ہو سکتے یا اُن کے نثر میں ادا کرنے سے وہ لطائف پیدا نہیں ہوتے جس کا ایک رُخ واقعات کی جھلک کھاتا ہے

اور دوسرے معنی اُس پر پالٹیکس کا پردہ ڈالتے ہوں۔ یہ مقام بہت باریک ہے اور شاعری کے حاصل شعر اور غایت فکر کا ماہو المطلوب اسی مقام کو سمجھنا چاہیے۔ یہ مقام ایک ناظم کا مقام نہیں جو موزونیت طبع سے شعر موزوں کر لیتا ہے۔ جیسے ایک عالم عام علوم کے ساتھ طب پڑھتا ہے لیکن حکیم عبدالمجید خاں اور شفاءالدولہ نہیں بن جاتا اور یہ ادراک بھی عام نہیں بلکہ مبدء فیاض سے جس دماغ کو جتنی فراست غایت ہوا اُسی کو شعر میں لا سکتا ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست		تا نہ بخشد خدائے بخشندہ	

وزارت کے عہدہ پر ہر شخص مامور ہو سکتا ہے لیکن ابوالفضل علّامی گلیڈ اسٹون۔ بسمارک۔ سالار جنگ۔ جعفر یحییٰ خالد نہیں ہو سکتا۔ ہر کالج کا سیکرٹری۔ سیکرٹری کہلائے گا لیکن سر سید احمد خاں۔ اور نواب محسن الملک کا دماغ کہاں سے لائیگا ایسے ہی ہر شخص شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن موضوعات اور محسوسات شاعری کے اقسام موثرات کو اُس طاقت سے زیادہ ظاہر نہیں کر سکتا جو اُس کے دل اور دماغ میں ہے تاہم جو مطالب عام شاعری کے دستور العمل اور ضابطہ کلی کے موافق بیان کئے جائیں۔ اُن سے بھی ایک قابل قدر دلچسپی کی رہنمائی ہوتی ہے جیسے کوئی عہدہ دار اپنے ضابطہ مقررہ کے موافق کام چلائے تو اُس سے کوئی بلند خیالی ظاہر نہ ہو لیکن عام بدنظمی اور بے ضابطگی سے پاک ہوگا۔ کیونکہ شاعر کو شاعری کا سانچہ اور اُس کے اصول موضوعہ ہر طور پر معائب سے بچاتے اور حسن کلام کی راہ دکھاتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کیمسٹ گنگا کی ریت سے سونا نکالتا ہے اور نہایت حقیر چیزوں سے بڑے بڑے کام کی چیزیں پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح شاعری سے فائدہ اُٹھانیکے لئے ایک کیمسٹ کی نگاہ پیدا کرنا چاہیے۔ ایشیائی شاعری ایک نہایت قابل قدر دفینہ ہے۔ جب اُس کو کھود کر عمیق نظر سے دیکھو گے تو اُس میں چاندی سونا ہیرا لعل موتی وغیرہ طرح طرح کی قیمتی اور بیش بہا چیزیں تم کو دستیاب ہوں گی اور جو ٹھیکریاں ہوں گی اُن سے بھی سونے کی ذات پیدا کر سکو گے۔ اور جو زمین اس سے خالی ہے وہ شاعری نہیں ہے۔

حُسن

پیارا ہے تو عزیز ہے تو نیرنگ سے بھر دیا ہے تجھکو		اور حُسن عجیب چیز ہے تو خالق نے اثر دیا ہے تجھکو

خدا اور بادشاہ کی طرح حُسن بھی شاعری کا ایک زبردست عنصر ہے عشق و عاشقی کو اُس کے توابع میں سمجھنا چاہئے جیسے شمع روشن ہوئی اور پروانے آموجود ہوئے۔ اور مظاہر حُسن اور مناظر حُسن لاتعداد و لاتحصیٰ ہیں جو جس کو بھائے اور جہاں جس کا دل لگ جائے اُس میں مدرکات روحانی اور محسوسات جسمانی دونوں کو دخل ہے۔ اور خدا اور بادشاہ دونوں کے انوار و اسرار کے رموز و دقائق کا لحاظ کیا جاتا ہے اور وہی نسبتیں اس کے لئے پیدا کیجاتی ہیں حُسن کے لئے ایک خاص پالٹکس ہے جو ہر وقت عاشق و معشوق کے درمیان اپنے جذبات باطنی اور کیفیات طبعی کے اظہار کو کام میں لایا جاتا ہے۔ وُہی اسرار۔ وُہی انوار۔ وُہی راز۔ وُہی نیاز۔ وُہی داب۔ وہی آداب۔ ایک دوسری صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اور خدا کی مناجات اور بادشاہ کے قصیدہ کی طرح یہاں غزل سے کام لیا جاتا ہے۔ غزل کے معنی کیا ہیں سخن با محبوب گفتن۔

جناب نواب عماد الملک مولانا سید حسین صاحب بلگرامی نے علی گڑھ کالج میں جو اسپیچ کہی وہ مقصود شاعری کا اصلی جوہر ہے اور وہ اسپیچ اخبار البشیر اٹاوہ ۲۶ مارچ ۱۹۰۶ء میں چھاپی گئی ہے۔ اُس میں عالی دماغ اسپیکر نے حسن کی نسبت فرمایا ہے۔

ہم نے یونانیوں سے سب کچھ حاصل کیا مگر سب سے زیادہ بیش قیمت چیز کو چھوڑ دیا ہم میں اُس یونانی روح کا نام و نشان نہیں پایا جاتا جو موجودہ زمانہ کی نئی زندگی اور تعلیم و تربیت کی رگ و پے میں اس طور سے سمائی ہوئی ہے جیسے گلاب کے پھول میں خوشبو۔ موجودہ علم اخلاق یونان کی حُسن پرستی کا

ایسا ممنون ہے جیسا کہ دیگر علوم کا جو براہ راست اخلاق پر اثر ڈالتے ہیں کیونکہ نیکی اور حسن میں بہت گہرا لگاؤ ہے اور ہم اس سے واقف نہیں وہ تربیت یافتہ اور فارغ البال زندگانی جو فنون لطیفہ مثل علم البیان اور تعاقب حسن (خواہ کسی صورت میں ہو) کا ثمرہ ہے۔ ہم میں بالکل معدوم ہے۔

اس اسپیچ کی معنوی توضیح کے سمجھنے کو کوئی خاص کتاب ہمارے سامنے نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اس خیال کی ماخذ کا پتہ لگایا جائے تو ایشیائی شاعری سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے جس سے نثر کے مجامیع خالی ہونگے۔ ہاں ایک مذاق سلیم کے موافق انتخاب اور اقتباس کی ضرورت ہے اور نیز یہ کہ ان کے اشعار پر جدید مذاق کے موافق حکیمانہ توضیحات کا حاشیہ چڑھایا جائے جیسا کہ سرسید نے بعض لٹریچر کے معنوی مقاصد کو دوسرے قالب میں لاکر مذاق جدید کے موافق بنانے میں کوشش کی ہے اور وہ کوشش ایک خاص حد تک مقبول عام ہوئی ہے۔

ملکات شاعری

ابتدا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کے دل پر مناظر حسن کی تجلیاں اپنا اثر پیدا کرتی ہیں اور ایک شاعر تین صورتوں میں اکتساب فن کرتا ہے پہلے کتاب کے ذریعہ سے مشق سخن کرنا۔ دوسرے کسی آشفتہ حال کے حالات رازداری پر مطلع ہو کر ان کو نظم کا لباس پہنانا تیسرے خود روئے زیبا کا محو دیدار ہو کر اس کے جذبات اور واقعات کو شعر میں ادا کرنا۔ ایسے ہی بادشاہ سے متعلق تین مقام ہیں ایک سعدی کی گلستاں یا اخلاق ناصری اور انوار سہیلی اور شاہنامہ پڑھکر اس کے حقیقت کو سمجھنا۔ دوسرے درباری مذاق کو اہل دربار سے سن کر اس کا چربا اتارنا تیسرے خود دربار میں شریک ہو کر ہر چیز کو آنکھ سے دیکھنا اور ہر بات کو کان سے سننا اور اس کو شعر میں ادا کرنا اور بادشاہ سے اوپر خدا کے مقام معرفت کا اکتساب بھی تین ذریعہ سے

حاصل ہوتا ہے ایک معرفت کی کتابوں کو دیکھنے سے دوسرے کسی صوفی اور شیخ وقت سے اسرار باطنی کا علم حاصل ہوتا۔ تیسرے خود مقام معرفت تک پہنچکر شاعر بننا۔ اور شاعری تین قسم کی ملکات طبعی پر مشتمل ہے۔

(۱) ابتدائی قسم کا ملکہ شاعری اُن کیفیتوں میں حاصل ہوتا ہے جو آنکھ ناک کان اور دوسرے ذرائعہ سے دل اور دماغ میں وارد ہوتے ہیں۔ اور اُن سے ایک قسم کے جذبات باطنی کا ہیجان ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کو مظاہر قدرت اور مناظر فطرت سے جیسے گل و بلبل ریحان و سنبل۔ خط و خال حسن و جمال ظاہری سے دلچسپی یا دلبستگی ہے۔ اس درجہ کے ممتاز لوگوں میں میرزا صائب۔ علی حزیں۔ اور اردو میں جناب داغ وغیرہ کے دیوان قابل ملاحظہ ہیں۔

(۲) دوسرے قسم کا ملکہ شاعری وہ ہے جو دماغ کی قوتوں کے نتائج اور مدرکات حسیہ سے فراخور استعداد پیدا ہوتا ہے۔ اس کا تعلق سلطنت کے اسرار اور پالیٹکس کے مفہومات سے وابستہ ہے اس درجہ کے لوگوں میں حکیم خاقانی۔ فردوسی۔ میرزا غالب جیسے سخن طراز داخل ہیں۔

(۳) اور سب سے اعلی درجہ کا ملکہ شاعری جزو نبوت ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں انوار یزدانی اور اسرار ربانی کا القا اُس کے دل پر ہوتا ہے۔ اور مبدء فیاض سے آپ ہی آپ اُسکے خیال کے متعلق حقایق کی جلوہ گری شروع ہوتی ہے۔ یہ مقام مولانا روم۔ حافظ شیراز جیسے لوگوں کا ہے۔

یہ تین کیفیتیں ہیں جو ایک شاعر کے دل اور دماغ اور اُس کی طبعی سرشت کے حسب استعداد و قابلیت اُس میں داخل ہوتی ہیں اور باندازۂ فہم و قدرت اپنی دیکھی اور اُس سمجھی ہوئی بات کو شعر میں ادا کرنے سے لطف اٹھاتا ہی دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک درجہ کا شاعر دوسرے درجہ میں رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اور کبھی اول درجہ کے لوگ نیچے درجوں میں بات کرنے لگتے ہیں۔ اور کبھی نیچے درجے والے بلند مقام میں سخن سرا

ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُردو میں میرزا غالب اور حضرت امیر مینائی کے کلام سے ہر طرح کا اقتباس کیا جا سکتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی اور منیر شکوہ آبادی کے خیال پر اول درجہ کے مقامات کا سایہ پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان تین حالتوں کے بعد ایک کیفیت وہ ہے جو موزوں طبعی یا کلام کو موزوں کر لینے سے شاعروں کے ساتھ ملاتی ہے۔ جیسے میں خود ہوں کہ میں نے دس ہزار شعر سے زیادہ موزوں کیئے ہونگے۔ لیکن اپنے آپ کو شاعر نہیں کہہ سکتا اور ایسے موزوں کلام متکلم کو صرف ناظم کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ کبھی کبھی اس قسم کے لوگوں کو بھی درجات شاعری سے کچھ حصہ مل رہتا ہے۔ لیکن اُن کی عادت اُس پر جاری نہیں اور نہ ملکات شاعری بطور عادت کے اُن میں داخل ہوئے ہیں۔

اردو اور شاعری

افسوس بدنصیب اُردو کو ملکات سہ گانہ شاعری اور اُن تینوں درجات سے جو اوپر مذکور ہوئے کسی ایک ملکہ راسخہ کی تکمیل و تعمیل کا موقع نہیں ملا۔ نہ وہ طریقت حقیقت شریعت کے زینوں پر چڑھی نہ اُس نے ملاء اعلیٰ سے کوئی تعلق پیدا کیا۔ نہ اُس کو غزالی اور زمخشری جیسے ائمہ کلام سے مصافحہ کا اتفاق ہوا اور نہ اُس نے مولانا روم اور حافظ شیراز جیسے بہشتی طائروں کو زمزمہ سنج سُنا۔ نہ مسجدوں کی جماعت کا سین اُس کی نگاہ سے گزرا۔ نہ وہ مندروں میں ناقوس برہمن کے نغموں کو پہچاننے والی ہوئی۔ خانقاہوں کو اُس نے بالکل اُجاڑ پایا جہاں اہل حال کی جگہ کچھ ابابیلیں اُڑتی نظر آئیں۔ شاہی دربار تک اُسکی رسائی نہیں ہوئی۔ اور نہ بادشاہی رزم و بزم کی خدمات سے اُس کو ادائے فرائض کا موقع ملا۔ یوں کہو کہ اُردو کے وقت میں وہ دربار ہی باقی نہ رہا جو ہر طرح کے ایشیائی مذاق کا معدن ہوتا۔

پس وہ دونوں اعلیٰ مقام تو یوں نکل گئے۔ اب رہے صرف معشوق اور مناظر حُسن وہ

بھی اعلیٰ درجہ کے مناظر جو محلات شاہی سے متعلق ہیں بدنصیب اُردو کو دیکھنا نصیب نہوئے صرف بازاری معشوقوں سے اُردو کی سوسائٹی کو تعلق رہا۔
جو مناظر علاؤالدین غوری جیسے اولوالعزم بادشاہ کو دیکھنا نصیب نہوئے جن مناظر نے شاہنشاہ جہانگیر جیسے شاہنشاہ کو برسوں مشتاق بنائے رکھا جو مناظر علی قلی اور عاقل خاں جیسے بہادروں اور آشفتہ حالوں کی زندگیوں کا خاتمہ کرنیوالے ہیں۔ اُن کی جگہ اُردو کو دلّی کے چاندنی چوک۔ اکبرآباد کے کناری بازار۔ لکھنؤ کے امین آباد۔ حیدرآباد کے چارمینار۔ اور کلکتہ بمبئی کی سڑکوں پر راستہ چلتے دو روپے کے معشوقوں سے کام پڑا۔

قسمت کیا ہر چیز کو قسّام ازل نے	جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا	غم ہم کو دیا سب میں جو مشکل نظر آیا

اس حالت میں طور کی تجلیاں کہاں سے پیدا ہوں۔ اور معمولی پیرایۂ سخن کے سوائے اعلیٰ درجہ کی خودداری اور ادب کا کام کیا۔ جہاں رقیبوں میں تلواروں سے فیصلہ ہوتا تھا وہاں لات جوتی سے کام لیا جاتا ہے۔ پس جو لوگ کہتے ہیں اُردو کی گندہ شاعری یا وہ اُردو کو ایشیائی شاعری سے موسوم کرکے اُس کو نام دھرتے ہیں اُن کو شاعری کی جگہ سوسائٹی پر جہاد کرنا چاہئے اور اُس کے ساتھ ہی اپنی جانب دیکھنا چاہئے کہ انکا طرزِ عمل کس حد تک قابل نکتہ چینی ہے۔ لیکن یہ اعتراض قانون پر عائد نہیں ہوسکتا۔ مثلاً سیکڑوں مسلمان شراب پیتے اور فسق و فجور میں مبتلا نظر آتے ہیں اس کے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ مسلمانوں کا قانون اور اُن کا مذہب قابل ملامت ہو ویسے ہی اگر بعض لوگ شاعری کو ادب کے حد میں پورا نہیں کرتے تو وہ شاعری اور قانونِ شاعری کا قصور نہیں۔ اور میں جہاں تک غور کرتا ہوں اس کا بڑا سبب ہماری مفتوحانہ حالات اور مردہ دلی اور سوسائٹی کی کس مپرسی اور نامقید حالتیں ہیں جو ادب کو بے ادبی کا مورد بنائے ہوئے ہیں۔ اور دنیا میں کوئی قوم نہیں پائی جاتی جس کی شاعری بغیر فاتحانہ اثر کے ترقی اور اثر کا دلچسپ اور دلنشین نمونہ بنی ہو یا

فاتحانہ حیثیت کے جاتے ہی اُس کے کمال پر زوال نہ آیا ہو۔ تاریخ پتہ بتاتی ہے کہ ہر قسم کی طبع آرائی کو وہ چیزیں لازمی ہیں جو بغیر فاتحانہ حیثیت کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ یونان۔ مصر۔ شام۔ فارس۔ شیراز۔ بخارا۔ سمرقند۔ بغداد وہی ہیں۔ اور اُسی نسل کے آدمی وہی کتابیں پڑھتے اور اُسی آب وہوا میں رہتے ہیں۔ لیکن جدّت خیال اور بلند پروازی کی وہ حالتیں باقی نہیں جاتیں۔ بخلاف ان کے جرمن۔ فرانس۔ انگلستان میں جہاں فتوحات کے دروازے کشادہ ہیں وہاں خوش طبعی اور بلند پروازی کی شاعرانہ امنگیں بھی ترقی پر ہیں اور اقسام شاعری کے لئے ہر قسم کے نمونے سامنے ہیں۔ میرے نزدیک اُردو شاعری نے جو کچھ کیا اور جو کر رہی ہے وہ بے انتہا قابل قدر ہے۔ یہ بات کہ اُردو نے کیا کیا اور کیا کر رہی ہے اس کو دوسرے حصہ میں بیان کروں گا۔ جس سے معلوم ہو کہ اُردو نے اس گوشہ گزینی اور بوریا نشینی پر ہر حصہ ملکات شاعری کی اعلیٰ سے اعلیٰ نمونوں کے مذاق کو کہاں تک اُڑایا ہے جس کو دیکھکر دوسری زبانیں انگشت بدنداں ہوں۔

مخصصات شاعری

(۱) یجوز لشاعر مالا یجوز لغیرہ۔ یعنی جائز ہے شاعر کو جو دوسرے کو جائز نہیں۔

(۲) شاعر بادشاہ کو تو۔ تم سے مخاطب کر سکتا ہے۔ مگر ناثر کو اعلیٰ حضرت۔ خداوند نعمت لکھنا ہوگا۔

(۳) روح کو نظم کا سُننا نثر سے زیادہ پسند ہے۔

(۴) شعر کا جانوروں پر بھی اثر ہوتا ہے ؎ اُشتر بشعر عرب درحالت است وطرب۔

(۵) شعر کو موسیقی کے ساتھ ایسا ہی قریبی تعلق ہے جیسے حسن کو نیکی سے۔ خوشبو کو باغ سے۔ روشنی کو چراغ سے۔

(۶) شعر ایک سانچہ ہے جس میں بے ڈول چیز نہیں ڈھل سکتی نہ اُس کی ناپ تول میں فرق پڑ سکتا ہے۔

(۷) ادب کے بھرنے کو نثر سے نظم کا ظرف زیادہ سمائی رکھتا ہے۔

(۸) صنائع شاعری ادائے مطلب کو طرح طرح کے پردے ہیں جن کے اندر شاہد معنی کو چھپایا جاتا ہے۔

(۹) سننے والے کے دل پر شعر کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اصول شاعری نے معشوقوں کے لئے غزل۔ بادشاہ کے لئے قصیدہ اور درگاہ صمدیت کے لئے حمد و مناجات میں عرض مطلب کا ڈھنگ اختیار کیا۔

ہماری شاعری کی غزل قصیدہ۔ مناقب۔ مناجات کیا ہیں۔ ایشیائی مذاق کے موافق منظوم ایڈریس ہیں۔ جن کی غرض خدا۔ بادشاہ معشوق۔ پیر۔ پیغمبر کی خوشنودی کو اپنی جانب مائل کرنا اور حسب رضا و مرضی کام نکالنا ہے۔

ہماری قوم میں جو گروہ مولوی کہلاتا ہے۔ اس کے دماغ میں شاعری کا حصہ نہ آنے سے اُن کے اذہان میں بلند پروازی کی قوت پیدا نہیں ہوئی اور تعاقب حسن کا مذاق جسکا ذکر مولانا بلگرامی نے کیا ہے اُن کے دماغوں سے علاحدہ رہا۔ مگر شاعری کی تہ میں اُس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ جو موجودہ شاعروں کے حُسن مذاق کی تعریف نہیں بلکہ خود شاعری کے حقیقی مذاق کی تعریف ہے۔ جس سے شاعر کو خواہ مخواہ اس دروازہ سے نکلنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ ہر چند ابھی اُردو میں کوئی ایک شاعر ایسا نہیں ہوا جس کے کلام کو ہم ایشیائی شاعری کا مکمل نمونہ کہہ سکیں لیکن اگر ہم مختلف شاعروں کے کلام سے مختلف اشعار کا اقتباس کریں تو ہم ایشیا کے مذاق شاعری کا مکمل نمونہ پیش کر سکتے ہیں جسکو مغربی دنیا بھی واجب التعظیم سمجھے اور ایسے کئی نام لے سکتے ہیں جن کی طبیعتیں ہر قسم شاعری کے ملکات راسخہ کا مکمل نمونہ پیش کر سکتی ہیں جسکو صحیح طور پر اصل کی نقل کہہ سکتے ہیں۔

ہماری شاعری پر اعتراض

اعتراض کئی قسم کے ہو سکتے ہیں ایک وہ جو اصول شاعری پر کیا جائے۔ دوسرے وہ جو کسی شاعر کے کلام پر وارد ہو تیسرے وہ جو اُس شاعری کے مذاق سے متعلق ہو آج کل دو قسم کے اعتراض پیش ہیں ایک وہ جو عام شاعروں کی خردہ بینی سے واسطہ رکھتے ہیں۔ جیسے ہمارے مخدوم احسان الہند مولانا شوکت اڈیٹر اخبار طوطی ہند میرٹھ نے عربی فارسی اردو کے سب شاعروں کے کلام پر قابلانہ اور فاضلانہ نکتہ چینی کا التزام کر رکھا ہے اور وہ ایسے ہی لوگوں کے سزاوار ہو سکتا ہے۔ ع

	ہر کوہ نہ تا بد این صدا را	

اور سچ یہ ہے کہ مولانا شوکت نے رسالہ پروانہ اور اخبار طوطی ہند کے ذرائع سے جو کام کیا ہر وہ ہر شخص کا کام نہیں ہو سکتا۔ اور اُس کا کوئی حصہ کسی کو ناگوار ہو لیکن اُن کی ژرف نگاہی خاص غور کے لایق ہے۔ دوسرے وہ اعتراض جو انگریزی کے نئے تعلیم یافتہ گریجوایٹ ایشیائی شاعری کی نسبت بطور مطاعن کے پیش کرتے ہیں۔ دراں حالیکہ اُنھوں نے دونوں زبانوں کے مقال و خیال کے مذاق اور اُن کے اسباب و علل اور ہر ایک کے معانی و مبانی میں غور و خوض نہیں کیا۔ اور یہ زیادہ قابل لحاظ ہیں اس لئے میں بعض مشہور مطاعن کا جواب دیتا ہوں۔

طعنہ۔ ایشیائی شاعری (اردو) کے موضوعات کلام میں مفروضات سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک شاعر فرضی عاشق بن جاتا ہے اور اپنے خاطر خواہ کسی کو فرضی معشوق بنا لیتا ہے۔

جواب

ایشیا کے طریق معاشرت اور مذاہب نے شاعری کو حد سے زیادہ آزاد ہونیکا موقع نہیں دیا۔ بلکہ اس کو ایک سٹڈیشن کا پابند رکھا ہے اس لئے فرضی عاشق اور فرضی معشوق قرار دیئے

گئے اور دو ناموں سے عشق بازی کو پسند نہیں کیا گیا۔ جب تک کہ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد
نل دمن۔ وامق عذرا۔ جیسے ہیرو زعلانیہ طور پر مبتلائے عشق نظر نہیں آئے جن پر کسی
طرح پردہ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اور اُن کے عشق کی سچائیوں نے جذبات شہویہ کے شرمناک
اثر سے اُن کو ہر طرح کے عیب سے بری ہونیکا سارٹیفکٹ دیدیا تھا۔ ہمارے یہاں ایک عورت
اپنے خاوند کا نام نہیں لیتی اور نہ خاوند بی بی کا نام لیتا ہے۔ اسی طرح عاشق و معشوق بھی
کھلے ناموں کو پسند نہیں کرتے اور ایک دوسرے کو اشارات افہامی سے یاد کرتے ہیں۔
جیسے وہ آئے تھے اُن کی خبر نہیں ملی۔ ایشیائی مذاق کا جاننے والا جان جاتا ہے کہ
اس کا مخاطب صحیح کون ہے اور یہ مذاق حیا، ادب کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے۔

طعنہ

ایشیائی شاعری میں جہاں دیکھو گل و بلبل۔ جہاں سنو شمع و پروانہ۔

جواب

جس ملک میں جو مناظر قدرت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں اور اُس ملک کا مذاق اُن کو منتخب
کر لیتا ہے وہی شاعری کی اجزا قرار پاتے ہیں۔ ایک کو دوسرے کے مذاق پر نکتہ چینی کرنے کا
حق نہیں۔ دیکھو۔ انگلش مذاق زلف جاناں کے بھورے بالوں اور چشم یار کی نیلی
پتلیوں کو پسند کرتا ہے لیکن ہمارے مذاق میں وہ خوش آیند نہیں چینی طبائع کو چشم محبوب
کی تشبیہ ایک گول آنکھ کی مچھلی سے دینا پسند ہے مگر اُردو مذاق اُس بساندا اور مچھلاندا اور
اُس گول گول آنکھ کی ترکیب کو چشم جاناں کی نسبت تصور کرنیکا روادار نہیں۔ عرب کیلئے
عرب کی اونٹنی کیسی عجیب معشوقہ ہے لیکن ہمارے مخدوم و مکرم مولانا شبلی صاحب نعمانی
سابق پروفیسر عربی مدرستہ العلوم علی گڑھ حال ناظم دینیات حیدر آباد و سیکرٹری کمیٹی اصلاح
و ترقی اُردو اُس عربی اونٹنی کو جناب فصیح الملک نواب میرزا خاں صاحب داغ اُستاد
اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہٗ یا مولانا حالی مدظلہ العالی کے دروازہ پر چھوڑ آئیں تو اُن کو اُردو

میں باندھنا مشکل ہو گا اور وہ ہندوستان کے ہرن کے بدلے عرب کی اونٹنی کا لینا پسند فرمائینگے وغیرہ علیٰ ہذالقیاس۔ اب رہی یہ بات کہ گل و بلبل اور شمع و پروانہ کو خصوصیت کیوں ہے۔ اُس کی صورت یہ ہے کہ ایشیا میں حیاء و ادب کو مذہب اور معاشرت میں دخل عظیم رہا ہے اس لئے اُس نے ناموں کا لکھنا اصولاً پسند نہیں کیا اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو عام طور سے دیکھی اور دکھائی جاسکتی ہیں۔ اور وہ متعلم کے لئے عشق و حسن کے جذبات اور ہر طرح کی تعلیم کا آسان نمونہ بن سکتی ہیں جس سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا ہے

بہتر آں باشد کہ سر دلبراں		گفتہ آید در حدیث دیگراں	

طعنہ

ایشیائی شاعری نے جھوٹے قصے تراشے اور دور از کار باتیں بنائی ہیں۔ کوئی دیو و پری کا افسانہ کہہ رہا ہے۔ کسی نے دیو کی تعریف کی تو ایسی کہ اُس کا سر مشرق میں ہے اور پاؤں مغرب میں۔ اور ایک پر جنوب میں ہے تو دوسرا شمال میں۔ کسی نے لکھا کہ صبح کو دریا میں غوطہ لگایا تو مرد ہو گیا۔ اور شام کو غوطہ لگایا تو عورت بن گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں باولی میں پریاں رہتی تھیں کوئی سبز پری تھی کوئی سرخ پری۔ کہیں لال دیو نکلا۔ کہیں کالا دیو۔ بھلا یہ باتیں قیاس میں آنے کی باتیں ہیں۔ ان پر انگلش سوسائٹی کے نوجوان جو نیچرل سینریوں کی شیفتہ ہیں خندہ زن نہوں تو کیا ہو۔

جواب۔ کس زبانِ مرانمی فہمد ✦ بعزیزاں چہ التماس کنم

واقعی آپ کا کہنا آپ کی سمجھ کے موافق ٹھیک ہے اور ایسا کہنا اس لئے ہے کہ آپ نے ایشیائی شاعری کے مذاق اور اُس کے اصول معانی کو دریافت نہیں کر پایا۔ ورنہ ہم سے زیادہ آپ اُس کے شیفتہ نظر آتے۔ اور جیسے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ایشیائی استعارات کو اپنے عربی کے دیوان سبحۃ المرجان میں خرچ کیا جس کو دیکھکر شعراء عرب مرحبا کہتے ہیں ویسے ہی آپ

ان استعارات کو انگریزی میں بیجا کر یہ تحفہ انگلستان کی نذر کرتے تو آپ کا خاص یادگار ہوتا -

عزیزو یہ زمانہ کی خوبی اور شاعری کی بدنصیبی ہے کہ شاعری کا اعلیٰ سے اعلیٰ مذاق یوں مطعون ہو رہا ہے۔ کسی قوم کا جب زمانہ خراب ہوتا ہے تو اُس کے تمام محاسن عیوب سے بدتر ہو جاتی ہیں۔ اور جیسے کسی آدمی کے مرنے سے پہلے اُس کی آواز پر ایک خاص مردنی کی علامت محسوس ہونے لگتی ہے ویسے ہی کسی قوم کے مرنے سے پہلے اُس کا ادب مرنیکی علامتیں ظاہر کرتا ہے۔ اور سخن جو ہر زندہ آدمی کے جینے کی پہچان ہے اُس میں ایک لازمی تغیر نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ جب زبان بند ہو جاتی ہے تو اُس کے مرنے میں شبہ نہیں رہتا اگرچہ بعض سکتہ کی حالتیں کچھ دیر کے لئے اُس کی زندگی کا آسرا دینے یا اُسکی زندگی کو قایم رکھنے والی ہوں۔ پس اگر تم اپنی زندگی کی علامت (زبان ادب شاعری) کو قایم رکھنا چاہتے ہو تو بقائی سخن سے اپنی زندگی کا منصوبہ باندھو ورنہ اپنی ایشیائی زندگی سے ہاتھ دھوؤ اور دوسرے جسم میں جنم لینے کے لئے راضی ہو۔

دوستو میں نے ایک رسالہ ایشیائی شاعری کے مذاق خاص اور اُس کی اصول کی فلاسفی پر لکھا ہے۔ اُس میں تفصیلاً ایسے خیالات کا ذکر کیا ہے اور یہاں اجمالاً اُنکو نقل کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ ایشیائی شاعری نے جھوٹے قصے نہیں تراشے۔ ہماری شاعری کے اصول میں جھوٹ بولنا بدترین گناہ سمجھا گیا ہے۔ اور جھوٹ نہ بولنے کے لئے دوسری تدبیریں اختیار کی ہیں جس کو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ ہاں فرضی قصے ضرور بنائے ہیں۔ اور دور از کار باتیں جان بوجھ کر بنائی ہیں۔ جیسے فرانس کے شہنشاہ نپولین نے فرنچ ڈکشنری سے ناممکن کا لفظ نکلوا دیا تھا تاکہ بڑے سے بڑا خیال ناممکن نہ سمجھا جائے اور وہ دور از کار باتیں اس لئے بنائی ہیں کہ اُن کے سمجھنے میں دماغ پر زور پڑے اور اُس سے عقل کی روشنی ترقی کرے اور اُن کے پڑھنے میں وہ لطف اور دلچسپی حاصل ہو جو دلوں کو لازمی طور سے اُس طرف متوجہ رکھے۔ میں اُن میں الف لیلہ بوستان خیال کے نام خاص طور سے لے سکتا ہوں۔

اور دیو پری کے افسانے بہت صحیح لکھے گئے ہیں۔ اور وہ سب استعارات ہیں۔ اور جو بات خود مفر و ضات کھکر پیش کی گئی ہو اُس کو واقعہ سمجھنا بجائے خود عقل کا قصور ہے۔

جناب والا۔ وہ دیو آفتاب ہے جس کا سر مشرق اور پاؤں مغرب میں ہیں اور ایک پر جنوب میں اور دوسرا شمال میں پیا ہے اور جب صبح کو غوطہ لگا یا تو مذکر کی علامت پائی یعنی دن ہوا اور جب شام کو غوطہ لگایا تو مؤنث کی علامت پائی یعنی رات ہوئی۔ اور پریوں سے مراد ہر قسم کے جانوران خوش رنگ و خوش مذاق سے ہے۔ دن کا استعارہ لال دیو سے اور رات کا سیاہ دیو سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس مذاق کے متعلق شہد کی مکھی اور شمع و پروانہ کی نسبت دو نظمیں لکھی ہیں سرسری طور سے پڑھنے میں ایک دور از کار افسانہ اور بنائی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے لیکن آخر میں جب اُس راز کو بتا دیا گیا ہے اور اُس کے موافق ہر استعارہ کی مطابقت کی جائے تو ایک خاص دلچسپی حاصل ہوتی ہے اور پڑھنے والے کے ذہن کو معنی فہمی کی جانب خاص دلچسپی سے مائل کرنا اس کا لازمی اثر ہے۔ ایسے ہی ہمارے مخدوم اور مشہور فاضل جناب شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی فیلو زیونیورسٹی الہ آباد نے جن کی حکیمانہ اور عالمانہ تصنیفات نے زمانہ حال کے نامور مصنفوں میں سب سے زیادہ اُردو کیلئے علمی سرمایہ جمع کیا ہے۔ ایک علمی اندر سبھا یا طبعیات کا پرستان بنایا ہے جس میں آفتاب کو اندر اور اُس کی شعاعوں کو پریاں بنا کر اُن کے وہ عجیب و غریب اور حیرت انگیز افعال دکھائے ہیں جس سے بے اختیار دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور کتاب کو تمام کئے بغیر دل نہیں مانتا۔ یہ کتاب سنئے گر یجوائیٹوں پر ایشیائی مذاق کا قابل قدر اثر ڈالنے میں اپنی وضع کی پہلی کتاب ہے۔

جناب شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی کے طرز بیان میں بھی لطیف استعارات کی رنگینی خاص قبولیت اور عام دلچسپی رکھتی ہے۔ اگر اُن کے بیان سے اس مذاق کا حصہ نکال لیا جائے تو کبھی یہ لطف باقی نہیں رہ سکتا۔ دیکھو اسی سال ۱۹۰۳ء کے جلسہ لاہور میں جو لیکچر انسان کے خلیفہ ہونے پر دیا ہے۔ اُس کے استعارات سے

ایک تیرہ سو برس کے خشک مضمون کو کیسا دلچسپ بنا دیا ہے۔ جو اُردو کا لائق تلاوت قرآن بن رہا ہے۔ سر سید احمد خان نے استعارات کی دلچسپ موشگافیوں سے اپنے کلام میں جو حسن قبول پیدا کیا وہ اُن کا اور اُن کی ادب فہمی کا حصہ مانا جاتا ہے اگرچہ وہ مذاق شاعری کی حد سے باہر علمائے کبار کے حد ادب میں منشار حقیقی کے موافق مانا نہ جائے۔

عزیزو۔ اولڈ علیشن والوں کے پاس تو وہ عینکیں نہیں جن سے سمندر پار کی صورتیں نظر آئیں لیکن تمہارے دماغوں سے امید کی جا سکتی ہے کہ تم اپنے ایشیائی دفینہ کو معلوم کرو اور اُس ذخیرہ پر فلسفیانہ نگاہ ڈالو اور ایک ایک بات کے معانی و میانی پر غور کر کے ایک مفید اور قابل قدر نمائش دکھاؤ اور ہر خیال اور ہر مذاق کے اسباب و علل دریافت کر کے اُن پر جدید فلاسفی کا حاشیہ چڑھاؤ تاکہ اخبارات اور مطابع کو بھی اُس رہنمائی سے کتابوں پر ریویو کرنے اور تقریظیں لکھنے کی راہ نکلے اور وہ جواہرات جو سینکڑوں من مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں وہ جلائے تازہ حاصل کریں۔ اور مغربی دنیا کو تم ایشیا کے نہایت دلچسپ موثرات اور ایشیائی سوسائٹی کے قابل قدر مذاق سے آگاہ کرنے والے ہو۔

اُردو شاعری اور انگلستان

ہم نے اس کتاب میں اپنی اپنی جگہ پر عربی۔ فارسی سنسکرت کی کتابوں کا برٹش میوزیم اور اکسفورڈ اور کیمبرج کے کتب خانوں میں پتا بتایا ہے۔ اُس کو دیکھ کر آپ خیال کریں گے کہ کیا وہاں کے کتب خانوں میں ہماری اُردو کا بھی پتہ ہے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہے لیکن بہت شرمناک اور افسوسناک۔ اُس کی صورت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں میرزا رفیع السودا۔ اور نظیر اکبر آبادی کے دیوان بھیجے گئے ہیں۔ اور ظفر شاہ خاتم سلاطین مغلیہ دہلی اور واجد علی شاہ خاتم تاجداران لکھنؤ کے دیوان بھی ارسال ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ حیدر آباد کی بی چندہ طوائف کا دیوان صاحب رزیڈنٹ کی معرفت ارسال ہوا ہے

مگر ان سب کی شاعری میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہے جو مغربی مذاق میں پسند ہونیکے لائق نہیں اور وہ صرف مشرقی سوسائٹی کی محرمیت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یا بعض اشعار کم سے کم شاعری کے درجات کمال میں دکھانیکے لایق نہیں۔ اور بڑے تعجب کی بات ہے کہ اکثر ہندوستانی اصحاب جو اُردو بولتے اور اُردو میں قابلانہ دستگاہ رکھتے ہیں وہاں تشریف رکھتے یا مختلف ضرورتوں سے تشریف لے جاتے ہیں لیکن اب تک اکسفورڈ اور کیمبرج میں اُردو کو نمایاں کرنے کا کوئی قابل قدر انتظام نہیں ہوا۔ ہمارے نزدیک علی گڑھ کالج اور اُردو کی کمیٹی کو خاص ضرورت اس کی ہے کہ وہ اردو کی ترجمہ شدہ اور تصنیف و تالیف شدہ ہر قسم کی پسندیدہ اور قابل قدر کتابوں اور شاعری اور ادب کے مخصوص دواوین اور منشات کا ایک ذخیرہ فراہم کرکے اور نہایت عمدہ جلد بندی وغیرہ سے مرتب کرکے ایک ایک صندوق اکسفورڈ اور کیمبرج کو روانہ کردے اور اگر اسباب میں خاص مطابع اور خاص طبائع اپنی ذاتی فیاضی اور کوشش سے کام لیں تو اپنی زبان کا ایک حق ادا کرنیوالے ہوں گے۔

حُسن بیان

جیسے زبان نیچر کا معجزہ ہے ویسے ہی حسن بیان آدمی کا چلتا ہوا جادو ہے۔ مسلمانوں کی آسمانی کتاب جس کی فصاحتوں اور بلاغتوں کو لاثانی تسلیم کیا گیا ہے اُس کے پڑھنے کو بھی قرأت اور الحان کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور جس کو یہ بات حاصل نہیں اُس کو پسند نہیں کیا جاتا۔

گر تو قرآں بدیں نمط خوانی ٭ ببری رونقِ مسلمانی

موسیقی کا جاننے والا کیسا ہی صاحب کمال ہو لیکن وہ اچھی آواز اور موسیقی کے نغموں اور زمزموں کو خوش ادائی سے ادا کرنے کی لیاقت نہیں رکھتا تو سُننے والے کو اُس کے حرام ہونے میں دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یورپ میں پرنس بسمارک اور گلیڈاسٹون کی اسپیچوں کو اُن کا حسن بیان خاص طور سے چمکا دیتا تھا۔ شمس العلماء

مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی کی تقریر میں حسن بیان کا حصہ سامعین کو خاص طور سے انکی تقریر سننے کا مشتاق بنائے رکھتا ہے۔ میر انیس اور میر نفیس اور میرزا دبیر اور میرزا اوج کے سُننے کو ہزاروں آدمی اُن کے شیفتہ پائے گئے، خوش بیان خطیب اور واعظ کے وعظ و خطبہ سُننے کی نسبت خاص رجحان ظاہر کیا جاتا ہے ویسے ہی شاعر کو حُسن بیان کی خاص ضرورت ہے جو اُس کے کلام کو خاص دلچسپی سے سُنا جائے اور اسی لئے موسیقی کو شاعری کی سواری بنایا گیا ہے اور آپ تھوڑے غور میں تمیز کرسکتے ہیں کہ آپ نے جو اشعار کسی خوش بیان کی زبان سے سُنے یا کوئی غزل کسی خوش آواز گانے والے کے ذریعہ سے آپ کے کانوں میں پڑگئی اُس کا لطف مستزاد حاصل ہوا ہوگا

مشرق اور مغرب

جب خدا کسی قوم کو اقبال مند کرتا ہے تو وہ اپنی برائیوں کے چھوڑنے اور دوسروں کی بھلائیوں کے اقتباس میں کوشش کرتی ہے ؎

متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد

اور جب کوئی قوم ادبار میں مبتلا ہوتی ہے تو وہ دوسروں کی بُرائیاں قبول کرتی۔ اور اسکو اپنی بھلائیوں کا احساس نہیں ہوتا اور اُس سے اچھے بُرے میں غور و خوض کی عادت چھُٹ جاتی ہے۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہم کو اپنے اور اقبالمندان مغرب کی بات بات سے ملتا ہے۔ اور ہر باب میں وہ فائدہ کی طرف اور ہم نقصان کی سمت جاتے معلوم ہوتے ہیں۔

اسی طرح جب کوئی قوم فاتحانہ اولوالعزمی کے ساتھ ترقی کرنا شروع کرتی ہے تو وہ آگے چل کر اُس فاتحانہ ترقیات کے مزے اُٹھانا چاہتی ہے بڑے بڑے باغ لگائے جاتے ہیں اور اُس میں طرح طرح کے خوشنوا طیور چھوڑے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محل بنائے جاتے ہیں اور ان کو ہر طرح کے فرنیچر سے آراستہ کیا جاتا ہے اور طرح طرح کے

علماء اور فضلا اور حکیم و ندیم اُن محلوں سے دربار و مجالس کا سرمایۂ فخر و ناز بنتے ہیں اور شاہی دربار کی دلچسپی اور رونق کے سامان ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ان میں موسیقی اور شاعری کو خاص دخل ہے کوئی قوم ایسی نہ پائی جائے گی جس نے ترقی کی حالت موسیقی اور شاعری کو اپنا جلیس و ہمدم نہ بنایا ہو۔ خصوصاً ایشیا نے ہزاروں برس اس شغل میں وہ اعلیٰ مذاق پیدا کیا ہے جس کے بگڑے ہوئے نشان اب بھی تمام دنیا کی موسیقی اور شاعری سے بلند تر پائے جاتے ہیں پھر جب اُس قوم کا اقبال گرنا شروع ہوتا ہے تو جیسے ایک آدمی کے مرنے سے پہلے اُس کی زبان کا بند ہونا لازمی پایا جاتا ہے۔ ویسے ہی قوم کے مرنے سے پہلے اس کی زبان اور اُس کا ادب بے حس ہونا شروع ہوتا ہے اور اُس کے مذاق علم کا ٹمپریچر اعلیٰ سے اسفل کی جانب اُترنا قبول کرتا ہے اور ابتدا میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کے گذشتہ لوگوں کی تقلید کرتے اور نقل اُتارتے یا اُن کے خیال و مقال میں کمی اور بیشی کرکے کام نکالتے ہیں جس کو ایک زندہ آدمی کا مردہ جسم کہہ سکتے ہیں۔ پھر تیسرا دور اُس مردہ جسم کی تصویر اُتارتا ہے جس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر فلاں شخص کی ہے لیکن اُس سے اُس کے اوصاف کمال کی امید نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال ہماری ایشیائی شاعری کا ہے اور جو ہماری قوم کے انگلش تعلیم یافتہ یا ہندوستان کی دوسری قوموں کے گریجوایٹ خیال کرتے ہیں کہ مغربی لٹریچر کی سنیریاں اور اُس کا طرز ادا اُس کا حصہ ہے اور وہ گھر سے نکل کر ایک پھول کے درخت پر شام کو چڑیوں کا چہکنا یا پھولوں کا لہکنا پتوں کا ہلنا اور سمندر کی لہروں میں زبان کی خوبی اور جس کو شاعر اور ادیب کے اوج خیال سے تعلق ہیں۔ یہ صرف مقال کی دلچسپی ہے۔ جیسے موسیقی میں دادرہ جو خواہ مخواہ اچھا معلوم ہوتا اور مگر اُس کو ٹپہ خیال دھرپد جیسے اعلیٰ موسیقی سے واسطہ نہیں۔ وہی حال مغربی مقالات کی دلچسپی اور مشرقی خیالات کی گہرائی کا ہے۔

اور ہمارا موجودہ زمانہ بجز اس کے کہ جنگل پہاڑ دریا سمندر دھوپ چاندنی اور نیچر کی عام چیزوں سے دلچسپی حاصل کرے اُس کو وہ مقامات کہاں نصیب جو کسی قوم کو سینکڑوں ہزاروں برس کی ترقی کرنے کے بعد نصیب ہوتے ہیں اور یا اُن کو السنہ کے مذاق خاص سے تعلق رہا ہے

مثلاً ایک بادشاہی دربار کے لئے اُتنے آداب مقرر ہیں جو ایک بڑی کتاب میں سما سکتے ہیں اور ہر مقام کے مناسب حال القاب اور آداب اور الفاظ کا لانا ضرور ہے لیکن اب زمانہ نے سب سے ترک تعلق کر کے ایک حضرت سلامت۔ پیارے دوست۔ مائی ڈیر۔ کو سرمایہ ادب فرض کر لیا ہے۔ اور اُس کے ساتھ اس کو اچھا بھی جانتا ہے جو صرف ادب کے نہ جاننے کی وجہ سے ہے اور اُس کا نہ جاننا اس لئے ہے کہ ضرورت نہیں۔

شاعری کی اجمالی کیفیت

(۱) جب ہم باغ میں جاتے ہیں تو آبجو کی روانی۔ سرو و شمشاد کی خوش قامتی۔ بلبل کی نغمہ سرائی۔ کوئل کی کوکو۔ فاختہ کی حق سرہ۔ گل و لالہ کے تختے۔ چمیلی اور بیلے کے پھول۔ نسیم سحری کے ہلکے ہلکے جھونکے مجموعی طور سے ہمارے دل پر ایسا اثر کرتے ہیں کہ کوئی باطنی قوت جوش میں آتی ہے اور ہم پر ایک نئی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ جب ہم سمندر کے کنارے پر کھڑے ہوتے ہیں تو پانی کی لہروں کا تموج اور دریائی جانوروں کا تیرنا جہازوں اور کشتیوں کا ادہر اُدہر چلنا پھرنا دل پر ایک فوری اثر پیدا کر دیتا ہے۔ جب ہم کسی گاؤں میں جاتے ہیں تو سرسبز کھیت۔ باغ۔ تالاب۔ میدان۔ جنگل اور پہاڑ کی چوٹیوں کا نظارہ ایک جدید اور محسوس ہونے والا اثر پیدا کر دیتا ہے۔ یہ قوتِ روحانی ہر موقع پر قدرتی نظاروں کا اثر محسوس کرنے کے بعد ایک قسم کا جوش پیدا کرتی ہے اور بےساختگی کے ساتھ زبان سے کچھ نہ کچھ الفاظ نکلوا دیتی ہے۔ جو اثر میں ڈوبے ہوئے اور تاثیر سے لبریز ہوتے ہیں۔

(۲) اسی طرح بزم۔ رزم۔ خلوت۔ جلوت۔ رفتار گفتار کا فوٹو لینا شاعری کا کام ہے۔ جو اُس ملک یا قوم کے مذاق کے حسب حال تیار ہوتا ہے

(۳) ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص یک چشم (کانا) ہوتا ہے اُس کی صورت دیکھنے سے ہمارا نظارہ خوش نہیں ہوتا جس مکان کے دروازہ پر چوکھٹ کے ایک جانب طاق ہو اور دوسری جانب نہ ہو تو اوس کا معائنہ خوشگوار نہیں ہوتا۔ ہم اپنے کمرہ کا دروازہ بناتے ہیں تو دروازہ کی ڈاٹ کے دونوں قوس ٹھیک مساوی رکھتے ہیں اگر بال برابر کا فرق ہو جائے تو کمرہ خراب معلوم ہوتا ہے دور کیوں جاتے ہو آدمی ہی کو دیکھو کہ سر سے لیکر پیر تک دونوں جانب ایک عضو کا جواب دوسرا عضو ہے اس تقریر سے معلوم ہوا کہ انسان کی روح میں ایک قوت ہے جو موزونیت اور لطافت خواہ برابر کی دو چیزوں یا ایک چیز کے دو حصوں کی مساوات اور باقاعدگی کو پسند کرتی ہے اور اسی کو نظم پسندی کی قوت سمجھنا چاہیئے۔

(۴) ہم دنیا میں دو ہی قسم کی چیزیں دیکھتے ہیں ایک قدرتی جیسے درخت پہاڑ۔ دریا۔ بادل ستارے انسان حیوان وغیرہ دوسرے وہ چیزیں جن میں انسانی صنعت کو دخل ہے جیسے مکان۔ صندوق قلمدان۔ ٹوپی۔ لیمپ۔ قالین وغیرہ اور ان دونوں کے دیکھنے سے ہماری جو قوت مناسبت اور موزونیت کا اندازہ کرتی ہے اُسی کو ہم شاعری کے نام سے موسوم کرنا چاہتے ہیں۔

(۵) شاعری کا درجہ نظم سے بالاتر ہے نظم ایک معمولی بات ہے اور شاعری حکیم کے غور کا نتیجہ اور نکتۂ حکمت۔

(۶) شاعر کے حواس ظاہری اور باطنی عام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ کیفیات اور تاثرات کے ادراک کی قوت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ شاعر چیزوں کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے عوام ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر چیزوں کے اصلی حسن و جمال پر جس طرح نظر کرتا ہے عوام ہرگز نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک نقاش اور فوٹوگرافر کسی مکان کے نقشہ اور کسی صورت کی تصویر میں جو باریک لطائف دریافت کر سکتے۔ اور اُن کو بسیار خستگی سے اُن کے اچھے برے

کی تمیز ہوتی ہے وہ دوسرے کو نہیں ہو سکتی۔ سادہ کار کی مثال ناظم کی ہے جو چاندی کی پتر پر نہایت نازک نقاشی کرتا اور ایک چیز کو نہایت سادگی اور صفائی سے بناتا ہے اور شاعری کی مثال اعلیٰ درجہ کے جڑیئے سے دی جا سکتی ہے جو سونے کا زیور بنانے کو اُن کے تیہوے بنانا گھاٹ درست کرتا اور ایک ایک نگینہ کو مناسب مقام پر جڑتا ہے جس کا مال سادہ کار کے مال سے زیادہ قیمتی اور اُسکا کام سادہ کار کے کام سے زیادہ قابل قدر ہے۔ دوسری مثال نظم اور شاعری کے مومی موتیوں اور سچے موتیوں سے دی جا سکتی ہے۔ مومی موتی معمولی تمیز سے ایک ڈورے میں پروئے جا سکتے ہیں لیکن سچے موتیوں کو قرینہ سے درجہ بدرجہ بٹھانے اور اُن کو سلک مسلسل میں پرونے کا کام خاص جوہری کا ہے جو معمولی نگاہ اور معمولی سلیقہ سے سرانجام نہیں پا سکتا۔

(۷) جیسے کسی بُری اور بدشکل تصویر کا اثر مصوری پر نہیں پڑ سکتا بلکہ مصور کا بھونڈا پن کہا جا سکتا یا خود اُس صورت کی کراہت سے علاقہ رکھتا ہے۔ ویسے ہی اگر آج کل ہم سے اچھے شعر نہیں کہے جا سکتے یا اچھے شعر کہنے کے مناسب حال سامان ہم کو میسر نہیں تو اُس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ شاعری ہم کو شرمندہ اور گنہگار کر رہی ہے بلکہ اس کے معنی یوں کہنا چاہیئے کہ ہم شاعری کو شرمندہ اور گنہگار کر رہے ہیں۔

شاعری کو مذاق سلیم کی ضرورت

جیسے حسن کے دیکھنے کو اچھی آنکھوں کی ضرورت ہے ویسے ہی شاعری کو مذاق سلیم کی ضرورت ہے۔ جیسے ایک اندھا آئینہ اچھی صورت کو نہیں دکھا سکتا ویسے ہی ایک بدمذاق شاعری کی لطافتوں اور اُس کے حُسن معانی کو نہیں دریافت کر سکتا۔ دلی اور لکھنؤ کی تاج محل یا خاقان بیگم اور امریکہ اور پیرس کے شاہی خاندان کی لیڈی جو اپنی ہمجولی کے ساتھ مصروف خرام ہوں تو اُن کے شکوہ و تبختر کا امتیاز کرنا۔ اور اُس شاہی وقار و امتیاز کی داد دینا معمولی نگاہ کا کام نہیں ویسے ہی شاعری کے شان و شکوہ اور اُس کے لطائف حسن کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

موسیقی کے اعلیٰ مقامات ہر نغمہ خواں کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اور نہ اُس کی بے شعوری اور بے علمی اُس کو اُن لذتوں سے متلذذ کر سکتی ہے۔

مذاق سلیم کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ قدرت اور صنعت کے محاسن سے خوشی حاصل کرنیکا ایک خاص ذریعہ یا خاص قوت ہے۔ جس کو ادراک بھی کہتے ہیں لیکن مذاق سلیم اور ادراک میں ایک نازک امتیاز ہے جس کی نسبت انگلش لٹریچر میں موشگافیاں کی گئی ہیں۔ جیسے طبیعت محض ایک شے کے سمجھنے یا نتیجہ نکالنے سے ایک خوبصورت منظر دیکھکر یا ایک عمدہ نظم پڑھکر خوش نہیں ہو سکتی۔ ایسی چیزیں بسا اوقات اپنے آپ ہمارے دل پر اثر کرتی ہیں اور اُس حالت میں کرتی ہیں جب ہم اپنی خوشی کی کوئی وجہ نہیں بیان کر سکتے۔ بعض اوقات وہ ایک فلسفی اور ایک کسان ایک بچے اور ایک جوان پر یکساں اثر کرتی ہیں۔ پس جس قوت سے ہم ان محاسن کا لطف اٹھاتے ہیں وہ ادراک کی بہ نسبت حسن باطنی سے زیادہ متعلق معلوم ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اُس نے ایک خارجی حس سے اپنا نام مستعار لیا ہے جس قوت سے ہم طعام کی لذتیں حاصل کرتے ہیں اُس نے مختلف زبانوں میں لفظ مذاق (ذائقہ) کو اُس مجازی معنی میں پیدا کر دیا ہے جس پر اب ہم غور کر رہے ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ ادراک یا علمی کے مذاق سے بالکل خارج ہے

جس اصطلاح میں ہم نے مذاق کو بیان کیا ہے اُس میں مذاق ایک ایسی قوت ہے جو ایک گونہ کل آدمیوں میں مشترک ہے۔

انسانی سرشت میں حُسن کی لذت سے ہر ایک واقف ہے۔ حُسن کی بھی کوئی قید نہیں کسی قسم کا ہو۔ جو شے باقاعدہ سڈول متناسب عظیم الشان خوش اسلوب نئی یا رنگین ہوگی۔ اُس کو دیکھنے سے دل کو ضرور مسرت ہوگی۔ جوان نوجوان چھوٹے بچوں تک میں نہایت ہی کم عمری میں مذاق کے اصول کی ہزاروں صورتیں نمایاں ہوتی ہیں وہ خوبصورت اشیاء سے رغبت کرتے ہیں۔ تصویروں اور کھلونوں کو پسند کرتے ہیں۔ ہر قسم کی نقلی اور نئی اور نادر چیزوں سے

اُن کو بے انتہا الفت ہوتی ہے۔ گنوار سے گنوار آدمیوں کو قصہ کہانیوں سے دل آویزی ہوتی ہے اور وہ زمین و آسمان کے قدرتی مناظر دیکھکر متاثر ہوتے ہیں حتی کہ جنگل کے وحشیوں میں جہاں انسان نہایت ہی غیر تربیت یافتہ حالت میں رہتا ہے زیور اور کپڑے کا رواج ہے جنگ اور موت کے گانے گائے جاتے ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مذاق سلیم کے اصول کی گہری بنیاد انسان کے دل میں ہے۔

ہر چند کوئی شخص اس قوت سے قطعی مبرا نہیں ہے لیکن وہ جس درجہ مختلف لوگوں میں پائی جاتی ہے بالکل جدا گانہ ہے۔ بعض لوگوں میں مذاق سلیم کی صرف ایک ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے جس قسم کے محاسن کو وہ پسند کرتے ہیں وہ نہایت ہی بھدی قسم کے ہوتے ہیں اور ان محاسن کا اُن کو ایک کمزور اور پریشان خیال رہتا ہے۔ اور بعض لوگوں میں مذاق سلیم اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے اور وہ نہایت نفیس قسم کی خوبیوں کا چٹخارہ عجیب لطف کے ساتھ لیتے ہیں بادی النظر میں ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ انسان میں مذاق سلیم کی قوتوں میں مسرتوں میں حس مشترک ادراک اور رائے کے لحاظ سے ایک نمایاں عدم مساوات پائی جاتی ہے لیکن یہ عدم مساوات کسی قدر اُس کی طبائع کے اختلاف کی وجہ سے ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض آدمیوں کے اعضا اور باطنی قویٰ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ لطیف اور نازک ہوتے ہیں۔ اور ایک حد تک تعلیم و تربیت کو بھی اس میں دخل ہے۔ اس کی تصدیق مزید اُس افضلیت سے بھی ہو سکتی ہے جو ایک ہی قوم میں اُن لوگوں کو جنہوں نے فنون لطیفہ سیکھے ہیں۔ اُن لوگوں پر ہے جو غیر تعلیم یافتہ اور جاہل ہیں۔

اب میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا کہ کن ذرائع سے مذاق کی تحصیل و ترقی میں اس قدر نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے قدرت کے اس بڑے قانون پر غور کیجئے کہ مشق و مزاولت ہماری کل قوتوں کی اصلاح و ترقی کا خاص ذریعہ ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کا پیشہ یا کاروبار اُن سے قوائے مدرکہ کی باریک مشق و

و مہارت کراتا ہے۔ اُن کے احساس نہایت تیز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پالش کرنے والوں کی قوت لامسہ اور لوگوں کی بہ نسبت نہایت لطیف ہو جاتی ہے

جن لوگوں کو آلات خوردبین سے سروکار رہتا ہے یا جواہرات کا کام کرتے رہتے ہیں وہ باریک سے باریک چیزیں عجیب و غریب صحت کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ جو لوگ مختلف قسم کے عطر یا اشربہ کی تقطیر کے کاموں پر مقرر ہیں اُن کی قوت شامہ نہایت تیز ہو جاتی ہے اور وہ مرکبات کو محض خوشبو سے پہچان سکتے ہیں۔ اگر مذاق سلیم کو ایک سیدھی سادی قوت فرض کر لیا جائے تو وہ متواتر مشق اور کامل توجہ سے بڑھ سکتی ہے اس کا بدیہی ثبوت مذاق سلیم کے اُس حصہ سے ملتا ہے جو موسیقی سے متعلق ہے۔ تجربہ سے روز بروز یہ بات ہویدا ہوتی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ کوئی چیز ترقی پذیر نہیں ہے۔ شروع شروع میں معمولی سے معمولی اور سادے سے سادے راگ پسند کئے جاتے ہیں۔ پھر مشق و مہارت ہمارے انشراح کے احاطے کو وسیع کر دیتی ہے اور رفتہ رفتہ نہایت مشکل مقامات کے لطائف سے آگاہ کرتی ہے۔ اور انسان کی آوازوں کے علاوہ مختلف سازوں میں نغمہ اور زمزمہ کی باریکیوں کو جاننے اور جو آواز اُن سے پیدا ہوتی ہے جس کو معمولی مذاق نہیں جانتا اُس کو پہچاننے لگتے ہیں۔ اسی طرح آنکھ نقاشی اور مصوری کے محاسن یکبارگی نہیں معلوم کر سکتی بلکہ آنکھ میں یہ قدرت تصویروں سے واقفیت پیدا ہوتے ہوتے اور چابکدست مصوروں کے نمونے دیکھتے دیکھتے پیدا ہو جاتی ہے علیٰ ہذا۔ حُسن تحریر اور حُسن تقریر کے لحاظ سے انشا پردازی کے اعلیٰ نمونوں اور مقبول نظیروں پر توجہ رکھنے اساتذہ کا کلام پڑھنے اور ایک ہی قسم کے محاسن میں اعلیٰ اور ادنیٰ درجات کا مقابلہ کرنے سے مذاق کی اصلاح ہوتی ہے جب کوئی شخص شروع شروع میں کسی اوستاد کے کلام سے شناسا ہوتا ہے تو ابتدا میں اُس مذاق پریشان اور دھندلا ہوتا ہے وہ اس شے کے مختلف محاسن و معائب بیان نہیں کر سکتا۔ وہ حیران رہتا ہے کہ میں کس بنیاد پر اپنی رائے قایم کروں۔ اس سے فقط اتنی ہی توقع ہو سکتی ہے کہ وہ بادی النظر میں اپنی خوشی اور ناخوشی

کا اظہار کر دے لیکن جو جو اس قسم کے کاموں میں اُس کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے اُس کا مذاق رفتہ رفتہ زیادہ سلیم اور روشن ہوتا جاتا ہے وہ صرف کلام کی نوعیت سے پہچاننے نہیں لگتا بلکہ ہر حصہ کے حسن و قبح اُس کو معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اس میں اس قدر ملکہ ہو جاتا ہے کہ جن چیزوں کو اُس نے اچھا یا بُرا کہا ہے اُن کی مخصوص صورت بیان کر سکے۔ ہر چند مذاق سلیم ایک حس ہی پر مبنی کیوں نہ ہو لیکن اُس کو بہت وسیع معنی میں دیکھنا چاہیئے۔

اس سے مطمئن ہونے کے لئے ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اساتذہ سلف کی تصانیف کا بیشتر حصہ صرف قدرت کی نقل اور انسان کی سیرت اعمال اور اطوار کا خاکہ ہے

جو مسرت ان حالات اور بیانات سے حاصل ہوتی ہے محض وہ مذاقِ سلیم پر مبنی ہے لیکن یہ امتیاز کرنا کہ وہ ٹھیک طور سے نمایاں کئے گئے ہیں یا نہیں ادراک کا کام ہے جو اصل کو نقل سے مقابلہ کرتا ہے۔

مثلاً شاہنامہ پڑھتے وقت ہماری فرحت کا زیادہ تر سبب کلام کی بندش قصہ کا تسلسل اور بیان کی سلاست ہے۔ ایسی نظم سے جو اُمنگ پیدا ہوتی ہے وہ حسِ باطنی کے طور پر مذاق سلیم کے ذریعہ سے محسوس اور حاصل ہوتی ہے لیکن نظم میں ان صفات کا انکشاف ادراک کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور جس قدر یہ ادراک نظم کی مناسبت اور موزونیت ظاہر کرتا ہے اُسی قدر ہم اُس سے محظوظ و مسرور ہوتے ہیں۔ انہیں دو وسائل یعنی حُسنِ مذاق کی متواتر مشق اور ادراک اور عقل سلیم کے باقاعدہ عمل سے مذاق بطور ایک قوت طبعی کے ترقی کرتا ہے۔ اور وہ اپنی مکمل حالت میں در اصل فطرت اور ہنر دونوں کا مجموعی نتیجہ ہے۔

ہم کو اس بیان میں اس قدر اور اضافہ کرنا ہے کہ اخلاقی نیکیاں بھی مذاق سلیم پر ایک قریب یا بعید اثر ڈالتی ہیں جس شخص کا دل سخت اور خراب ہے جو شخص یہ نہیں جانتا کہ کون چیز در اصل عمدہ اور قابل تعریف ہے جس میں نازک اور لطیف چیزوں کی ٹھیک پرکھ نہیں وہ فصاحت و بلاغت اور شعر و سخن کے اعلیٰ ترین محاسن کو نہیں سمجھ سکتا۔

اعلیٰ مذاق کی نوعیت اپنی اکمل حالت میں دو چیزوں پر تقسیم ہوسکتی ہے۔ نزاکت اور صحت۔ نزاکت مذاق خاص کر اُس قدرتی حِس کی تکمیل سے متعلق ہے جس پر مذاق مبنی ہے۔ اس سے مراد وہ لطیف تر اعضا یا قویٰ ہیں جنکی مدد سے ہم کو وہ محاسن نظر پڑتے ہیں جو ایک گنوار آدمی کی نظر میں پوشیدہ ہیں۔ ایک شخص کی قوتِ احساس کتنی ہی بڑھی ہوئی ہو لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ وہ مذاق لطیف میں قاصر ہو۔ وہ ان محاسن کو دیکھکر کتنا ہی متاثر ہو لیکن اُس کو صرف وہی شے نظر آتی ہے جو کسی قدر بھدّی نمایاں یا اُبھری ہوئی ہے۔ لیکن سادہ اور نازک تر زیبائشیں اُسکی نظر سے مخفی رہتی ہیں جاہل اور غیر تربیت یافتہ قوموں میں بالعموم اسی قسم کا مذاق ہوتا ہے۔ لیکن نازک مذاق آدمی پر جو اثر پڑتا ہے وہ مضبوط بھی ہوتا ہے اور صحیح بھی۔ وہ ان تفریقات و اختلاف کو دیکھتا ہے جو اوروں کو نظر نہیں آتے۔ پوشیدہ سے پوشیدہ حسن اس کی نظر میں آجاتا ہے۔ اسکو باریک سے باریک عیب معلوم ہو جاتا ہے۔ لطافت مذاق کا بھی وہی معیار ہے جو ہم ایک حس خارجی کی لطافت جانچنے میں استعمال کرتے ہیں جس طرح ایک خوش ذائقہ شے اُس کے اجزا کی آمیزش (نہ کہ تیز خوشبوؤں) سے پہچانی جاتی ہے اور باوصف اُس امتزاج کے تمام اجزا جدا جدا خلق کو محسوس ہوتے ہیں۔ اُسی طرح حسن باطنی کی نزاکت لطیف سے لطیف مشترک سے مشترک اور پوشیدہ سے پوشیدہ جس تیزی ادراک اور نازک مزاجی کی مدد سے دریافت کر لیتی ہے۔ صحت مذاق صرف اُس اصلاح سے متعلق ہے جو قوت مذاق کو ادراک کی تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ صحیح مذاق کا آدمی وہ شخص ہے جو مصنوعی محاسن سے کبھی دھوکا نہ کھائے جو ہمیشہ اپنے دل میں عقل سلیم کا وہ معیار رکھتے جس کو وہ ہر شے کی جانچ کے لئے استعمال کر سکتا ہے وہ ان مختلف محاسن کے عیب و ثواب کا جو اُس کو کسی اوستاد کے کلام میں نظر پڑتے ہیں مناسبت کے ساتھ اندازہ کرتا ہے اُن کو اُن کی مقررہ جگہ دیتا ہے اور وہ اصول قایم کرتا ہے جن سے معلوم ہو کہ ان میں کس بات سے خوشی اور مسرت پیدا ہوتی ہے اور صرف اُسی درجہ تک محظوظ ہوتا ہے جس درجہ تک اُس کو خوش اور محظوظ ہونا چاہیئے۔

مذاق کو اس کی اکمل اور اصلاح شدہ حالت میں ظاہر کرنے کے بعد یہ غور کرنا چاہیئے کہ وہ اس حالت سے کیونکر تجاوز کر سکتا ہے۔ اس میں کون کون تغیرات واقع ہو سکتے ہیں اور ان تغیرات کی حالت میں صحیح مذاق کو ناقص سے امتیاز کرنے کا کوئی ذریعہ ہے یا نہیں۔ ہمارے کام کا یہ سب سے مشکل حصہ ہے کیونکہ یہ ایک مسلم قاعدہ ہے کہ اپنے عمل میں انسانی طبیعت کا کوئی جزو مذاق سے زیادہ تلون پذیر اور بے ثبات نہیں ہے اس کے تغیرات اس قدر وسیع اور بکثرت ہیں کہ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ناشی ہوتا ہے کہ وہ محض بے قاعدہ اور مطلق العنان ہے جسکی کوئی بنا اور جس کا کوئی معیار نہیں اور جو بعد میں تمام علوم اور تحقیقاتوں کو فضول اور بیکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ فن تعمیرات میں یونانی نمونے مدتوں تک نہایت کامل تسلیم کئے گئے ہیں۔ بعد کے زمانوں میں گاتھک قوم کا فن تعمیر غالب رہا۔ اس کے بعد یونانی مذاق پورے زور شور سے زندہ اور عوام کی نظروں میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ بلاغت اور شاعری میں ایشیائی قوموں نے سوائے ظاہری نمائش کے کسی چیز کو پسند نہیں کیا۔ علی الرغم اس کے یونانی صرف انہیں محاسن کی قدر و منزلت کرتے تھے جو پاک صاف اور سیدھے سادے ہوتے تھے۔ وہ ایشیائی تکلفات کو نفرت سے دیکھتے تھے۔ خود انگریزوں میں صدہا تحریریں جو دو یا تین صدی اُدھر نہایت مقبول و مطبوع تھیں اب نہایت بدنام اور گمنام ہیں۔ اُردو زبان کی انشاپردازی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ پچیس تیس برس پہلے مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب اور امانت کا واسوخت خاص طور پر پسند کئے جاتے تھے لیکن اب کا مذاق سادگی پسند ہے۔ اب یہ سوال ہے کہ ان تمثیلات سے کیا نتیجہ متخرج ہوتا ہے۔ کیا کوئی چیز ایسی ہے جسکو ہم مذاق کا معیار کہہ سکیں جس سے ہم اچھے اور بُرے مذاق کو پہچان سکیں۔ کیا یہ ایک کا مذاق جداگانہ ہے۔ یہ ایک نہایت ہی نازک اور مشکل مسئلہ ہے جس پر اب ہم بحث کرتے ہیں۔

اگر مذاق کا درحقیقت کوئی پیمانہ یا معیار نہیں ہے تو کُل مذاق یکساں ہیں۔ یہ وہ صورت ہے کہ خفیف معاملات اور ادنی اختلافات میں اس سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے لیکن

بڑے معاملات میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک بدو کا مذاق ایک ادیب کے مذاق کی طرح نازک اور صحیح ہے۔ ایک باقاعدہ تربیت یافتہ مذاق ٹلکیوں اور بانسریوں میں موسیقی کے اُن باریک نغموں اور زمزموں اور غزل ٹھمری کے لفظوں اور بولوں کو پہچان لیتا ہے جو معمولی مذاق سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ایک طبیب کا مذاق بیمار کے لون اور اُس کے چہرہ پر آنے جانے والی رنگتوں اور اس کے نبض کی رفتار سے صحت اور مرض کو تاڑ جاتا ہے لیکن عام طور سے یہ حالتیں دریافت نہیں ہوتیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایک شخص کے مذاق کو دوسرے شخص کے مذاق پر ترجیح دینے کی کوئی بنیاد ہے۔ اور مذاق میں بھی اچھائی برائی اور صحت اور غلطی ہوتی ہے اور انسان میں اختلاف طبائع کے ساتھ اختلاف مذاق بھی لازمی ہے جو ہر مذاق اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اپنی حد میں مکمل کہا جاسکتا ہے۔ ایک شخص کو نظم سے زیادہ دلچسپی ہے دوسرے کو نثر سے۔ ایک رزم کو پسند کرتا ہے دوسرا بزم کو ایک کامیڈی کو ترجیح دیتا ہے۔ دوسرا ٹریجیڈی کو ایک کو سادی عبارت پسند ہے دوسرے کو رنگین۔ نوجوان پُرجوش اور شوخ مضامین سے حظ اُٹھاتے ہیں۔ بوڑھے آدمی سنجیدہ اور متین مضامین سے خوش ہوتے ہیں۔ بعض لوگ بیانات اور خیالات دونوں میں صحت اور باقاعدہ نزاکت سے رغبت کرتے ہیں۔

ہرچند ان سب باتوں میں اختلاف ہے لیکن ہر شخص کو کوئی خاص حُسن مدّنظر ہے جو اُسکی طبیعت کے موافق ہے اور اس وجہ سے کوئی شخص دوسرے کے مذاق کو بُرا بھلا کہنے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ اگر کوئی ایک نتیجہ صحیح اور باقی نتائج غلط ہوسکتے ہیں تو یہ بات محض ادراک کے مسئلہ میں ہوسکتی ہے۔ مذاق کے معاملات میں نہیں ہوسکتی۔

ایک شخص ایک شے کو عمدہ بتاتا ہے اور دوسرا پسند نہیں کرتا تو اس کا نام اختلافِ ادراک نہیں ہے بلکہ اُس کو مذاق کی مخالفت کہنا چاہئے۔ ایک شخص حافظ شیرازی کے کلام کو فردوسی کے کلام پر ترجیح دیتا ہے۔ مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن کے خیال متخالف اور متضاد ہیں جبتک

کہ ہم اُن میں سے ایک کے محاسن کو ترجیح دینے کا صحیح معیار نہ رکھتے ہوں۔ اب یہ دریافت کرنا باقی ہے کہ وہ معیار کیا ہے جو اس قسم کے تفریق مذاق میں کام آسکتا ہے۔ معیار ایک صحیح طور پر وہ شے مراد ہے جو اس قدر مستند اور معتبر ہو کہ ہر خاص و عام اُس کو پسند کریں مثلاً سرکاری اوزان خانگی اوزان سے عام طور پر قابل استناد و اعتبار ہیں۔ در بار تربیت کا معیار صحیح کہا جاسکتا ہے۔

القصہ حُسنِ مذاق در اصل حسن کے ایک اندرونی حس پر مبنی ہے جو انسان نے اپنی طبعی حالت کے حسب حال پایا ہے۔ اور حس کو ادراک کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔

اب جس انسان میں کل قوتیں تکمیل کے ساتھ موجود ہیں جس کے محسوسات باطنی ہر حالت میں نہایت نازک اور صحیح ہیں حسن کا ادراک بحیثیا اور یقینی ہے۔ اونکی رائے دوسروں کے لئے ایک مکمل معیار ہو سکتی ہے۔ لیکن اس پر بھی یہ امر ممکن ہے کہ کوئی مذاق اُن کی رائے سے خوش ہونیوالا نہ ہو۔ انسان کی مختلف اور مخالف مذاقوں کی آزمائش کا کوئی کافی معیار نہیں جس پر سب کو راضی کیا جانا ممکن ہو اور حسن مذاق کی تمام چیزوں میں آخری مرافعہ انسان کی عقل اور ماہران فن کی کثرت رائے پر ہے جو سب سے زیادہ اُس کے ماہر اور شناسا ہیں۔ اگر کوئی شخص کہے کہ شکر تلخ اور تمبا کو شیریں ہے تو اُس کی کوئی دلیل اس بات کو ثابت نہیں کرسکتی اس لئے ایسے شخص کا مذاق بیمار سمجھا جائے اور صرف اس وجہ سے بیمار سمجھا جائے گا کہ تمباکو اور شکر کے اکثر جاننے پہچانتے اور اس کو استعمال کرنے والے افراد اس کے مذاق سے اختلاف رکھتے ہیں۔

ہماری اس تعریف میں کہ فنون میں حُسن کی آخری کسوٹی انسان کے خیالات کی باہمی موافقت ہے۔ ہمیشہ وہ آدمی مراد ہیں جو اُس کے اہل سمجھے جاتے ہیں اور اُن میں وہ اوصاف موجود ہیں جو اُس کی جانچ کے لئے ہونا چاہئیں۔ اور اُن کے سچے فیصلوں میں کوئی رعایت و شکایت تلوین و تلون پیدا نہیں کرسکتی۔

اور مذاق کی بے ثباتی اور تلون کے متعلق کچھ ہی کہا جائے لیکن تجربہ سے یہ بات طے ہو گئی ہے کہ بعض محاسن اگر مناسب صورت میں ظاہر کئے جائیں تو اُن میں استحکام اور عام پسندیدگی حاصل کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ ہر مضمون جو تخیل اور طبیعت سے تعلق رکھتا ہے وہ کل زبانوں میں کل قوموں کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ایسا تار ہوتا ہے جو ٹھیک طور سے چھیڑنے پر انسانی طبیعت سے ویسے ہی آواز بلند کرتا ہے چنانچہ بعض اساتذہ سلف کے کلام کو دنیا کی مہذب ترین قوموں نے عام طور پر اور ہمیشہ پسند کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ عام طور پر خصوصیت کے ساتھ مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ جیسے مولانا روم۔ حافظ شیرازی شیخ سعدی کا کلام۔ اور ہر زبان کا مذاق سلیم اُس کے مطالب سے حظ پاتا اور فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اب آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ جیسے آپ اچھی شاعری کے جویا ہیں ویسے ہی اچھی شاعری آپ کے مذاق کو رزم و بزم خلوت و جلوت رفتار و گفتار در بار و بازار کے ہر گوشہ میں ڈھونڈ رہی ہے اگر آپ اچھے شعر نہ ملنے سے خوش نہیں ہوتے تو وہ بھی مذاق سلیم کی نایابی سے سر پیٹتی ہے۔

شاعری کا وزن

شاعری کا پہلا کام مناسب درجہ و مقام لفظوں کو سوچنے کا ہے۔ جیسے ایک جڑیا۔ ہیرا۔ پنا۔ موتی یا قوت کی کنیوں چنیوں اور چھوٹے بڑے نگینوں کو کسی زیور میں جڑنے کے لئے اپنی قوت ممیزہ سے کام لیتا یا جوہری چھوٹے بڑے موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے کے ہر دانہ کو اسکے مناسب مقام جگہ دینے کیلئے پہلے سلک خیال میں جگہ دیتا ہے تاکہ وہ الفاظ شاعری کے رشتہ میں پروئے جاکر اس شعر کا مصداق بنیں ؎ میر انیس مرحوم۔

نظم ہے یا یہ در شہوار کی لڑیاں انیس
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

دوسرا کام اُن لفظوں کو مناسب موزونیت سے اپنی اپنی جگہ بٹھانے کا ہے۔

جس میں بال برابر کا فرق نہ ہونا چاہیئے مثلاً آفریں حکیم۔زبان۔بر بنام۔جہاندار۔جان سخن منتشر الفاظ ہیں۔اور جب شاعر نے انکو موزونیت سے شعر میں مناسب جگہ دی تو یہ شعر حاصل ہوا ؎

بنام جہاندار جان آفریں ۔ حکیم سخن بر زباں آفریں

اور شاعری کی ترازو اتنی صحیح ہے کہ اُس میں ایک حرف کا گھٹنا بڑھنا تو بہت بڑے بھاری وزن کی طرح ترازو کے ایک پلڑے کو نیچے جھکا دیتا یا اونچا اُٹھا بلکہ ذرا سے اشباع و اضافت کے بوجھ کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔

شاعری کے اوزان و میزان کا بہت پُرانا پتا سنسکرت اور عربی کی شاعری سے ملتا ہے جس کو عربی میں عروض اور سنسکرت میں پنگل کہتے ہیں۔مگر دونوں کی نوعیت میں فرق ہے جس کو میں یہاں بیان کرنا نہیں چاہتا۔اور فارسی کی قدیم شاعری کا عروض جداگانہ ہوگا کیونکہ قدیم پارسی میں چامہ و چگامہ کے لفظوں سے قصیدہ اور غزل کے وجود کا پتہ ملتا ہے اور شاعری کے متعلق ہر قسم کی اصطلاحیں موجود ہیں تو عروض کا ہونا بھی خیال کیا جا سکتا ہے لیکن فارسی پر عربی کی تاخت نے اُس کو اپنی جگہ پر قایم نہیں رکھا اور فارسی کی شاعری نے عربی کے ترازو باٹ لیکر اپنا کام چلایا۔چنانچہ مسلمانوں کے ابتدائے ورود فارس سے جس شاعری کا پتہ ملتا ہے اُس کے لئے عربی کے اوزان و میزان کام میں لائے گئے ہیں۔اور فارسی پر یہ علمی اعتراض باقی رہجاتا ہے کہ اُس نے اپنی شاعری کے لئے اپنی زبان کے مناسب حال اوزان و میزان فراہم نہیں کئے بلکہ فردوسی جیسا سخن طراز جو حتی الامکان عربی کے لفظوں کو اپنی شاعری کے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔اُس نے بھی عربی کے وزن و میزان سے کام لیا ہے۔چنانچہ اُس کے شاہنامہ کا وزن یہ ہے۔

فعولن فعولن فعولن فعول

پھر جب اُردو نے شاعری کا لباس پہنا تو جیسے اُردو نے زبان کا بہت بڑا حصہ فارسی سے

حاصل کیا ویسے ہی شاعری کے بحور واوزان ومیزان میں بھی فارسی کی تقلید کی۔ میرزا قتیل نے اپنی ذہانت سے اردو کے ایک شعر کی تقطیع اردو مذاق کے موافق کی تھی جسکی تفصیل یہ ہے

مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن

پری خانم۔ پری خانم۔ پری خانم۔ پری خانم

لیکن اس مذاق کو نوزادہ[19] بحور پر حاوی نہ کرسکے۔

شاعری کی ترکیب اور تشبیہ

شاعری مناسب الفاظ کے قطروں اور موزوں ترکیب سے دریا (بحر) بنتی ہے جس میں حسن کلام کا تموج طرح طرح کی خوشنما سینریاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور شاعری کی ترکیب کے لئے تشبیہ واستعارہ کا ہونا ایسا ہی ضروری اور دلچسپ ہے جیسے چاند سورج کا ہونا دریا کی اصلاح اور اُس کے جزرومد کو ضروری اور دلچسپ ہے۔ اور جیسے چاند سورج کی شعاعیں دریا کے پانی میں مل کر اُس کے حسن کو دوبالا کردیتی ہیں ویسے ہی تشبیہ واستعارہ کی آمیزش سے شاعری کے دریا کی روانی اور اس روانی کے حسن میں ایک لاثانی حسن پیدا ہوجاتا ہے۔ پہلے آپ کو ان قطروں (لفظوں) کی ماہیت سے مطلع ہونا چاہیے کہ وہ ہمارے دریا میں کہاں سے آکر ملے ہیں۔ ان قطروں سے میری مراد لفظوں سے ہے جس سے اردو شاعری کا دریا بنتا ہے۔ میرے خیال میں ایک وہ الفاظ ہیں جو براہ راست فارسی سے اُردو میں داخل ہوئے جیسے چشم۔ جہان۔ گیہان۔ دوسرے وہ جو اپنے مبانی اور مبادی سے فارسی ہونے کا سراغ دیتے ہیں لیکن اُن کو اردو نے دوسرے قالب میں ڈھال لیا ہے اور مختلف طور سے اُن کا استحالہ ہوا ہے جیسے فارسی کا آمدہ است اُس کو پہلے پنجاب میں بولا گیا۔ آوندا ہے پھر آگے چل کر کہا گیا۔ آوتا ہے۔ اور آخر کو دلّی میں پہنچکر آتا ہے بن گیا۔ تیسرے وہ الفاظ جو سنسکرت اور بھاشا سے براہِ راست لئے گئے اور وہ اُسی صورت سے بولے گئے جیسے جوتی

سروپ۔ نین۔ انجن۔ چوتھے وہ جن میں اُردو نے تصرف کیا جیسے کہا کرت کو کہا کیا کرتے ہو۔ پانچویں وہ الفاظ جو عربی سے براہ راست آئے اور اُسی صورت سے بولے گئے جیسے واللہ اعلم۔ چھٹویں وہ الفاظ جو انگریزی سے اُردو میں داخل ہوئے اور اُردو نے اُنکی صورت کو نہیں بدلا۔ جیسے مسٹر۔ ماسٹر۔ ساتویں عربی کے وہ الفاظ جن کی صورت اُردو میں بدل گئی۔ آٹھویں انگریزی کے وہ لفظ جو اُردو میں آکر دوسری صورت سے بولے گئے۔ نویں ہندوستان کے وہ الفاظ جو یہاں سے دوسرے ملکوں میں گئے اور وہاں سے دوسری صورت بدل کر آئے اور اُنکی موجودہ صورت کو اُردو نے قبول کیا۔ دسویں دوسرے ملکوں یا دوسری زبانوں کے لفظ جو اپنی اصلی یا دوسری صورت میں داخل اُردو ہوئے۔ گیارہویں وہ جن میں اردو کا تصرف ہوا۔ اب ترکیب کلام کو دیکھنا چاہیئے۔ ایک ترکیب وہ ہے جو ہم اپنے ملک اپنی قوم اپنے مذاق کے موافق شعر کہیں۔ دوسری وہ ہے جو ہم دوسری زبانوں کی تقلید میں سخن سرا ہوں۔ پھر اس میں بھی تفریق ہے۔ ایک وہ جو ایشیا کے مختلف مذاقوں سے حاصل کی گئی ہو۔ دوسری وہ جو ہم نے ایشیا کے مذاق کو بالکل بھلا دیا ہو اور یورپ کی تقلید میں ہم نے اپنے انداز بیان کو دوسرے طرز میں بدل دیا ہو جیسے آج کل انگریزی تقلید ہماری تصنیفات میں ترجمہ کی شان پیدا کر رہی ہے۔ اور ہم اپنے مواد کلام کو ہیر پھیر کر دوسرے سانچوں میں ڈھال رہے ہیں جس میں بڑا نقص یہ ہے کہ ہم اُس مذاق کے پرورش یافتہ نہیں اسلئے ہم اپنی شاعری کے اوج خیال کو اُس مذاق میں صرف نہیں کر سکتے یا کہ وہ مذاق ہمارے ہاتھوں ہماری شاعری کے اوج کمال تک نہیں پہنچا۔ اور جیسے اردو میں مختلف لفظوں کی شرکت اور تداخل نے شاعری میں ایک خاص اثر پیدا کیا ہے ویسے ہی اُردو کی مثالوں اور تشبیہوں کا وادی بہت وسیع ناپیدا کنار ہے اور ہر ملک کا درخت اس وادی میں اوگا ہوا نظر آتا ہے اور بعض درخت تو ایسے ہیں جن کو زمین کی تاثیر اور آب و ہوا کے مناسب اثر نے اُن کے ملکوں سے زیادہ یہاں پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے۔ اردو کی تشبیہات میں

بھی زیادہ تر فارسی اور کمتر عربی اور متوسط درجہ میں بھاشا کی تشبیہات کا پتا ملتا ہے اور اب مغربی دنیا کی تشبیہیں اضافہ ہوتی جاتی ہیں۔ اور تشبیہ ایسی چیز ہے جس کی ضرورت نہ صرف شاعری اور ادب میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ اُس کا سلسلہ نیوٹن کی تھیوری کی طرح ابتدائے تکلم سے پایا جاتا ہے اور اندھے گونگے بھرے بھی اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ بلکہ حیوانوں میں بھی محسوسات تشبیہی کا احساس پایا جاتا ہے۔

ہر قوم اور مذہب کے ادب اور شاعری کی کتابیں طرح طرح کی تشبیہات سے بھری ہوئی پائی جاتی ہیں۔ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ اور غرض تشبیہ اور ادات تشبیہ کا ہونا ضرور ہے جس کو شاعری کے اصول نے اختیار کیا ہے اور ہر ملک کی مخلوق و مناظر کی عام پسند دلچسپی کے حسب حال تشبیہات کو اختیار کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے عرب۔ فارس۔ ہندوستان۔ چین۔ یورپ کی تشبیہات اپنے اپنے ملک اور اپنی اپنی طبیعت کے حسب حال ہیں عرب کی اونٹنی یورپ کے بھورے بال چین کی گول آنکھیں ہر ایک ملک کے خاص مذاق سے دلچسپی رکھتی ہیں اور قدرت نے ہر قوم کو اپنے حسن اور اپنے ملک کے مناظر کا شیفتہ بنایا ہے۔

استعارہ

شاعری میں استعارہ تشبیہ سے زیادہ لطافت اور ملاحت کلام کی بہ نہایت رکھتا ہے۔ تشبیہ سے مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان ایک مغایرانہ فرق معلوم ہوتا ہے مگر استعارہ غیر کو عین بناتا اور مجاز میں حقیقت کی سیر کراتا ہے جیسے میرزا صائب اور غنی کشمیری کے دیوانوں میں تشبیہات کا لالہ زار پھولا ہوا ہے ویسے ہی ملا طغرا کی تصانیف نظم و نثر میں استعارات کی بہار جوش پر ہے اور اردو کے مختلف دواوین سے ہر قسم کی تشبیہات اور استعارات کا اقتباس و انتخاب ہو سکتا ہے۔ لیکن استعارات کا زیادہ ہونا ملاحت کلام کو شورہ زار بنا دیتا ہے۔ جیسا کہا ہے ؎

نمکِ استعارہ خوش باشد   لیک از حد چو رفت شور بود

مبالغہ

ایشیائی شاعری کا مبالغہ نیو فیشن میں بہت بدنام ہے۔ حالانکہ ہماری شاعری کا مبالغہ شاعر کو جھوٹ سے بچاتا ہے اور جس مقام پر شاعر اپنے معشوق یا ممدوح کی تعریف حد سے زیادہ کرتا ہے تو کوئی اُس کو واقعات میں خیال نہیں کرتا بلکہ وہ عام طور سے مبالغہ خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرے مبالغہ شاعر کے انتہائے قصد و ادراک کا پتا دیتا ہے اور اُس سے عقل و حکمت کے جو یا دوسرا سراغ لگاتے ہیں مثلاً شاعر نے اپنے ممدوح کے گھوڑے کو ایک ایسا کل کا گھوڑا بتایا جو اپنے سوار کو شملہ میں کفن اور کلکتہ میں حاضری کھلاتا ہے۔ تو اُس سے اُس شاعر کے محسوسات خیالی پر غور کرنا چاہیئے کہ اُس کے ذہن نے کس چیز کا ادراک کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خوش اقبال یورپ کے حکیمانہ خیالات میں ہماری شاعری کے اجزا سے زیادہ قابل استعجاب و تمسخر اجزا ملے ہوئے ہیں مثلاً ایک بڑا گروہ ستاروں کی آبادی کا خیال رکھتا اور ستاروں کی آبادی میں پہنچنے اور وہاں کے رہنے والوں سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نپولین نے ڈکشنری سے ناممکن کا لفظ نکلوا دیا تھا۔ اُس کے نزدیک آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ پس ان خیالات کے مقابلہ میں آپ کو ایشیائی شاعری کے مبالغہ پر ہنسنا خود آپ کے قصور اذہان کی دلیل ہی آپ کو معلوم ہے کہ روما کا مشہور شاعر ہومر اندھا تھا اور انگلستان کا مشہور شیکسپیر نہایت غریب اور معمولی اسکول میں پڑھکر تھیٹر میں بھرتی ہو گیا تھا۔ مگر ان دونوں کی شاعری اور اُن کے خیالات کی بلند پروازی نے سائنس اور فلاسفی کا وہ اثر ظاہر کیا جو آج تک معجزہ کمال مانا جاتا ہے۔ یہ ہومر اور شیکسپیر کی تعریف نہیں بلکہ اقبال مند قوم اور دقیقہ شناس سوسائٹی کی قدر شناسی ہے جس نے ہومر اور شیکسپیر کی شاعری کو

سائنس اور فلاسفی کے وادی میں نمایاں کیا - اور شاعری کے خیالات کو حکیمانہ مذاق میں دیکھا اور شاعری سے فنون حکمت کا اقتباس کیا - خدا ہماری قوم کو بھی شاعری سے ایسے افادات کا موقع دے اور وہ شاعری کو حکمت کے مصرف میں خرچ کرنے کا دماغ پیدا کرے اور جو خیال خیال کے درجہ میں نہیں یا کسی شاعر نے ایک بات کو قانون شاعری کے خلاف پیش کیا ہے اور اُس کا دور از قیاس بھونڈا پن پسندیدہ نہیں یہ اُس شاعر کا جہل یا اُس کے ناقابل قدر خیال کا باعث ہے اس سے شاعری کو کیوں بدنام کیا جائے۔

شاعری کی نسبت ایک رائے

نوشتہ مولوی سید محمد حسین صاحب رضوی مدرس اعلیٰ علوم ریاضی ریاست جھالرا پاٹن مندرجہ رسالہ حسن حیدرآباد

نہایت ہی قدیم زمانہ کے سیدھے سادے لوگوں کو دو باتیں شاعری کی طرف داعی ہوئیں تواریخ یا قصہ بڑا سبب ہے۔ جب لوگوں کو اگلے بزرگوں بہادروں اور دیوتاؤں کے حالات منضبط کرنے کی ضرورت پڑی۔ ان کو چونکہ اس وقت فن تحریر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ کسی ایسی شے کی طرف رجوع کرنا پڑا جس کا حفظ یاد رکھنا آسان ہو اور جس میں تھوڑے لفظوں میں بہت سا مطلب ادا ہو سکے۔ اس کام کے ادا کرنیکے لئے شاعری سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہ تھا کیونکہ نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے اور بوجہ اوزان و تقسیم مضامین وغیرہ نظم کا حفظ یا در کھنا بہ نسبت نثر کے بہت آسان ہے۔ پس سب سے پہلے اعلیٰ درجہ کی قسم نظم مثنوی ہے جس میں یا تو کسی بڑے بزرگ کی سوانح عمری ہوتی ہے جو آیندہ لوگوں کیلئے مثال ہو یا کسی بڑے شجاع و دلیر کی جس نے اپنی عزیز زندگی بیچ کر اپنے ملک یا اپنی قوم کو کسی یاد عظیم سے بچایا یا ہو حالات ہوتے ہیں یا کسی دیوتا کے جو کسی خاص فرقہ یا قوم پر مہربان ہوتا ہے کرامات اور خرق عادات کا ذکر ہوتا ہے یا اُس کے وہ افعال بیان کئے جاتے ہیں جن سے نوع انسان کو فائدہ پہنچا ہو۔ یہ ضرور نہیں کہ کسی خاص مثنوی میں ان میں سے کوئی خاص بات

ہر مثنوی ان حالات کا مجموعہ ہوتی ہے بلکہ اور بہت سی باتیں مثلاً طریق حکومت و طرزِ معاشرت بیان کئے جاتے ہیں۔ قریب قریب ہر اس زمانہ کی ہر مثنوی میں کسی حسینہ فتنۂ عالم کا بھی ذکر ضرور ہوتا ہے جس کے حسنِ عالم فریب پر دنیا کے بڑے بڑے واقعات لکھنے ہوتے ہیں بعض مثنویوں میں بڑے بڑے عمدہ اخلاقی مضامین استعارتاً بیان کئے گئے ہیں دوسرا گو معناً پہلا سبب حسنِ قدرت کی تعریف ہے۔ ان سادہ دل سریع الاعتقاد بزرگوں کے دل پر قدرتی اشیاء کا جوبن اور عجائبات روزگار اپنا اثر کئے بغیر کیونکر رہتے۔ جس وقت تک مختلف علوم نے انسان کے دماغ پر قبضہ نہ کیا تھا اور انسانی تجربہ بہت ہی محدود تھا تمام انسان کی قوتیں قدرت کے سامنے زانوئے شاگردی طے کرتی تھیں اور اس سے تجربہ حاصل کرنے میں مصروف تھیں۔ جس وقت قوائے ذہنی پوری طرح سے عالم خواب سے نہ چونکی تھی قوائے وجدانی اپنا پورا کام کر رہی تھی۔ اُس وقت میں ذرا سا ابھارنے والا اثر بھی دل کے ولولوں کو پوری طرح سے بھڑکا دیتا تھا پس حسن قدرت ان لوگوں کے دلوں پر مقناطیسی اثر رکھتا تھا۔ انتہا ہے کہ بعض خوشنما دلکش۔ نظر فریب فائدہ بخش چیزیں خالق خیال کی جاتی تھیں رات دن کی نظر آنے والی چیزیں مثلاً آفتاب کا نور۔ چاند کا حسن۔ تاروں کی جھلملاہٹ۔ قوس قزح کی بوقلمونی۔ آسمان کا نیلا پن۔ بادلوں کی سیاہی اور رفتار۔ صرصر کی تیزی نسیم و صبا کی خنکی ان کے دلوں پر ایسا اثر رکھتی تھیں جن کی وجہ سے وہ عمدہ اعلیٰ اور سچے مضامین پیدا ہوئے جو اس وقت بھی ایک سچے بامذاق پر درد دل کے بے چین کر دینے کو کافی ہیں۔

خانہ بدوشی کے زمانہ میں جب یہ لوگ اتفاق سے کسی صحرا میں جا نکلے وہاں کے درختوں کی بہار۔ ہوا کا چلنا۔ خودرو سبزے کا لہلہانا۔ پھولوں کا خداداد حسن۔ شبنم کے موتی تما قطرے۔ دریا کا بہاؤ۔ پہاڑوں کا جھاؤ نگاہ سے گذرا اور نوا سنجان

چمن کی سریلی آوازیں سنیں بیتاب ہو گئے۔ اور فوراً فی البدیہ یہ اشعار نظم کئے۔ یہ اشعار نظم کی فضول قیدوں سے پاک شاعری کے تکلفات سے بالکل مبرا۔ ان میں نہ مبالغہ کی چاٹ ہوتی تھی اور نہ بیہودہ دور از کار تشبیہ و استعارات کی چاشنی۔ بلکہ صاف صاف لفظوں میں بے تکلفی کے ساتھ حسن قدرت کا روشن بیان اور اُس اثر کا جو شاعر کے دل پر ہوا اس عمدگی سے ذکر کیا جاتا کہ جس وقت سنا جائے سننے والے کے دل پر وہی اثر ہو جو شاعر کے دل پر ہوا۔ اور وہی سماں نگاہ کے سامنے پھر جائے۔

چونکہ انسان مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے اس لئے خانہ بدوشی کا زمانہ مستقل اور دوامی نہیں خیال کیا جا سکتا تھا۔ آخر کار سفر ہائے مدامی اور جانوروں کے چرانے میں لوگ تنگ آئے اور یہ وحشیانہ زندگی ان کی کل حاجات کی کفیل نہ ہو سکی۔ بنابریں ان کو گانوں قصبے اور شہر آباد کرنے کی ضرورت پیش آئی تا کہ ان کی ساری ضرورتیں پوری ہوں۔ اور آپس کے خیالات کی تبدیلی سے عقل اور تجربہ کو کافی مدد پہونچے۔ اور معلومات کا ذخیرہ وسیع ہوا اس آپس کے میل جول اور عقل کی ترقی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان اشرف المخلوقات اور عالم اکبر ہے۔ جو حسن و خوبی خداوند کریم نے ہر ہر مخلوق کو جدا جدا عنایت کیں ہیں وہ مجموعتاً انسان کو ملی ہیں۔ جب شعرا نے یہ دیکھا اپنی بنی نوع کی مدح میں مصروف ہوئے اور وہ وہ لطیف و پاکیزہ مضامین پیدا کئے کہ جن سے اس وقت بھی مردہ دل آدمی تک پھڑک اُٹھتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے ممدوح یا معشوق سارے جہان سے نرالے کسی نئے عالم کر رہنے والے نہ ہوتے تھے۔ یہ بیچارے بیدہن اور بے کمر کے نہیں تھے۔ نہ انکے گیسوؤں کی سیاہی سامنے دیدار خدا محال تھا۔ بلکہ ان کی چال سے دلہائے عشاق پستے تھے اور ان کی ٹھوکر و نسی حشر برپا ہوتا تھا بلکہ یہ اپنے ہم جنسوں کی طرح سب اعضا رکھتے تھے اور انہیں کوئی ایسی انوکھی خوبی نہیں ہوتی تھی جو اُن کو دائرہ انسانی سے خارج کر دے۔ فرق یہ تھا کہ اوروں کی نسبت اُن کے اعضا سڈول ہوتے تھے۔ اور بعض بعض اور زیادہ دلکش۔ اُن کا قدرتی حسن اور تناسب اعضا

شعرا کو اپنی طرف کھینچتے اور شعرا ان کی مدح میں رطب اللسان ہوتے تھے۔ مگر وہ تعریف میں حد سے زیادہ تجاوز نہ کرتے تھے۔ میانہ روی کو کام فرماتے۔ جو جیسی چیز ہوتی اُس کی ویسی ہی مدح کرتے۔ جس نے اُن کے اشعار پڑھے شخص ممدوح بنفسہ آنکھوں میں پھر گیا۔ جب کسی بات پر اُن کو زیادہ زور دینا ہوتا زبان کی شستگی الفاظ کی بندش۔ خیالات کی پختگی۔ طبیعت کے زور سے اپنا مطلب ادا کرتے۔ یہ یاد رہے کہ وہ آج کے چانڈو باز شعرا کی طرح تکیہ پر سر رکھے مضمون کے فراق میں اونگھا نہ کرتے تھے۔ اور نہ مجنوں کے مانند ہر وقت ایک ہی خیال میں مستغرق رہتے تھے۔ بلکہ اُن کا کلام اکثر فی البدیہہ ہوتا تھا۔ ایک ایک عرب کا بدّو کسی میلے میں پانچ پانچ سو اشعار کا قصیدہ نظم کرتا اور اپنی ذہانت اور روانی طبع کی داد پاتا آج تک اس ملک میں جب علما میں زبان کی بابت مباحثہ ہوتا ہے۔ یہی ناخواندہ جنگلی اعرابی حکم ہوتے ہیں۔ اور ان کی رائے زبان کے بارہ میں حکم ناطق کا اثر رکھتی ہے۔ یہ ہی حال اُس زمانہ میں اور ملک کے باشندوں کا ہوگا۔ طرہ یہ کہ اس وقت کی فی البدیہہ اشعار آج کل کے اُن اشعار سے جو نہایت عرق ریزی اور دردسر کے بعد میسر آتی ہیں۔ بدرجہ عمدہ ہیں۔ ان اشعار کی تشبیہ ایک ایسے معشوق سے دی جاسکتی ہے جو اپنے حسن خداداد کے سامنے کسی عارضی سامان آرائش کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا اور خود اپنی زیور سادگی پر فریفتہ ہے اور آج کل کے نظم کی مثال اُس بوڑھی بازاری عورت کی سی ہے جو نہایت بناؤ سنگار کر کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہے مگر ذرا غور سے دیکھنے سے اُس کے حسن کی قلعی کھل جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر چیز کے واسطے ایک وقت مناسب ہے جس پر اُس کی بہار دلفریب اور خوشنما معلوم ہوتی ہے پس شاعری کے واسطے وہی زمانہ موزوں تھا۔ ہمارا زمانہ دوسری چیزیں چاہتا ہے اب انسان کے اُس جوہر شریف یعنی عقل کو جو انسان و حیوان میں مابہ الامتیاز ہے پوری ترقی ہو گئی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ عقل سلیم کب قوت اختراعی کے بیہودہ ڈھکوسلوں کو پسند کرتی ہے اور پسند بھی

کرتی۔ مگر شاعری کے افراط و تفریط حسن قبول کی مانع ہے۔ اب زمانہ علوم حکمیہ کا ہے۔

اصلی شاعری مدتوں سے وداع ہو چکی یہ زمانہ جس کو ہم بیان کر رہے ہیں، شاعری کی آمد کا تھا جب آمد اپنی غایت قصوری پر پہنچ چکی اور اکا علم بلند ہوا اور اس کے نام کا خطبہ چار دانگ عالم میں پڑھا گیا۔

مستقل طور سے آباد ہو جانیکے بعد ایک مدت دراز تک تو لوگ اپنے پرانے طرز کو نباہے گئے۔ آخر انسان کی جدت پسند طبیعت اپنا رنگ لائی۔ اب ان کو یہ سیدھے سادے گو سچے مضامین پھیکے اور بدمزہ معلوم ہونے لگے۔ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ شاعری نے بھی پلٹا کھایا طرز معاشرت کے بدلتے ہی اس نے بھی نیا روپ بھرا۔ سامانِ عیش کا بڑھنا تھا کہ انسان کے خیالات میں تغیر عظیم پیدا ہوا۔ اور اس تبدل نے شاعری کو اچھوتا نہ چھوڑا۔ اب شعراء نے اپنے خیالات کو لفظوں کا پرزور اور مکلف لباس پہنانا شروع کیا۔ ایسی ایسی انوکھی باتیں پیدا کیں جو اگلے بزرگوں کو خواب میں بھی نظر نہ آئیں سینکڑوں قیدیں لگا دیں اور شاعری سے آسان چیز کو پہاڑ سا مشکل بنا دیا۔ ردیف و قوافی اگرچہ اس سے پہلے زمانہ کی شاعری میں بھی موجود تھے مگر اب ان کی اس سختی سے پابندی کی جانے لگی کہ وہ اس کی قدرتی ترقی کی سد راہ ہوئی۔ بحور و اوزان ایجاد ہوئے۔ کوئی کلام موزوں جس کا قدم ان بحروں کے محدود احاطہ سے نکلا ہوا ہو۔ نظم نہیں خیال کیا جاتا۔ نظم کی مختلف قسمیں مقرر کر دیں۔ جن سے علیحدہ ہو کر کوئی شخص طبع آزمائی نہ کر سکا اس قسم کی قیدوں سے جب شاعری کی اصلی ترقی تنزل کی طرف مائل ہوئی تو اس نقص کے چھپانیکے لئے لفظی اور معنوی صنعتیں پیدا کی گئیں۔ اُن پر دور از کار تشبیہات و استعارات اضافہ کئے گئے۔ پھر ان سب کو مبالغہ کے بھبکے میں کھینچ کر مصنوعی شاعری کا حسن دوبالا کیا گیا۔ گو اس طمع سازی سے شاعری کا قدرتی حسن چھپ گیا اور ان اضافی حواشی سے متن شاعری کا منشا فوت ہو گیا مگر پھر بھی ہنرمند شاعروں نے اپنی دماغی قوت کے زور سے ایک ایسا سڈول اور انوکھی

تراش وخراش کا معشوق بنا دیا جس کے حُسن نظر فریب سے ایک مدت تک عالم نے دھوکا
کھایا اور اس مصنوعی تراشیدہ بت کو اصلی اور قدرتی دلربا گردانا واقعی نقل کو اصل اور آورد کو
آمد کر دکھانا انہیں ہنرمند اور اپنے ذہن کے پکے شاعروں کا کام تھا۔

اگرچہ شاعری کی بہار اُسی وقت سے ختم ہو چکی تھی جب سے آمد کا زمانہ رخصت ہوا۔ مگر
ابھی یہ چھیڑ چھاڑ شروع نہ ہوا تھا۔ یہ نوبت اُس وقت پہونچی جب انسانی تجربہ کافی طور پر وسیع
ہو گیا جس طرح عقل و دیگر قوائے ذہنی کو ترقی ہوئی۔ انسان کو شاعری کے طلسم سے نجات
ملتی گئی۔ اس جادو کے اثر کو ترقی علوم کے منتر نے زائل کیا۔ جب انسان کو اتنا ہوش ہوا
کہ وہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لے۔ دنیا میں بہت سے عمدہ اور مفید علوم کی
بنیاد پڑی۔ اب ذہنیات۔ طبیعات۔ فلکیات۔ ریاضی۔ طبابت وغیرہ علوم کی کتابیں
تدوین ہونے لگیں۔ جب ان علوم کے مصطلحات پر مغز مضامین بالتفصیل بیان کی شاعری میں
کھپت نہ دیکھی مجبوراً نثر کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اب چونکہ فن تحریر بھی ایجاد ہو چکا تھا اس وجہ
سے علوم کے حفظ یاد رکھنے کی بھی ضرورت نہ رہی یہ نثر کے طرف مائل ہونے کا دوسرا سبب
ہوا۔ اب نظم کی سلطنت بہت محدود ہو گئی اس کا صرف علم ادب میں حصہ رہ گیا جب
شعرا نے دیکھا کہ ان کی برتری کو زوال ہونے والا ہے۔ اب عقل کے سامنے قوت اختراعی کو
فروغ نہیں ہو سکتا۔ اور وہ کسی طرح حکما۔ علما۔ اور فلسفہ دانوں کے برابر نہیں خیال کئے جا سکتے
تو انہوں نے مصنوعی شاعری سے گریز کر کے پھر اصلی شاعری کے دامن میں پناہ لی اور انسانی وجدانیت
پر اپنا تسلط کیا۔ ایسے ایسے مضامین ادا کئے جن کے سننے سے انسان کے فطری جذبات جوش
میں آجائیں اور جس قسم کا مضمون ادا کیا جائے اس کا ویسا ہی اثر انسان کے دل
پر پڑے۔ اخلاقی اور تمدنی مضامین کی پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ ان کو اس خوبی خوش
اسلوبی۔ نرالی بندش نئی ترکیب سے روشن الفاظ پر اثر عبارت میں نظم کیا کہ جس سے
انسان کی طبیعت بے چین ہو جائے اور واقعہ کی تصویر نگاہ میں پھرنے لگے۔ ان مضامین کی

سچائی۔سادگی۔برتری۔عمدگی نے پھر نظم کو اپنے اصلی پائے شرافت سے ڈگرنے دیا۔بلکہ
ایسی شاعری انسان کے اخلاق کے رفارمر۔ان کی طرز تمدن کی مصلح۔ان کے علم ادب کی
حامی۔ان کے جذبات کی سچی مددگار خیال کی جانے لگی اور شعرا کو لوگ اُسی عزت و وقعت کی
نگاہ سے دیکھتے رہے۔جس ملک کے شعرائے زمانہ کی رمز کو نہ سمجھا یا سمجھکر تجاہل عارفانہ
کیا۔اُنھوں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری اور اپنے ہاتھوں اپنی پت گنوائی۔
یہ بھی واضح رہے کہ سب ملکوں میں ترقی ایک ساتھ نہیں ہوئی۔اسی وجہ سے سب
ممالک کے ایک ہی زمانہ کے شاعری کا رنگ یکساں نہیں ہے بلکہ جس طرح ایک
ملک نے مدارج ترقی کو طے کیا۔اسی طرح شاعری میں تبدیلیاں واقع ہوتی گئیں۔
ہر زمانہ میں طرز سلطنت کا شاعری پر بہت بڑا اثر پڑا۔جن ملکوں میں جمہوری سلطنت
کے اصولوں کی کچھ نہ کچھ بو موجود تھی وہاں کی شاعری بھی آزاد رہی۔اس کے قدرتی
حسن کو کسی چیز نے نہ بگاڑا اور کوئی امر اس کے قدرتی ترقی کا سدراہ نہوا۔وہاں کے شعرا
نے اس بدترین قسم نظم یعنی قصیدہ گوئی میں طبع آزمائی نہ کی۔میں نے قصیدہ کو بدترین قسم
نظم اس غرض سے کہا ہے کہ آج کل کے قصائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باستثنا ئے
چند کُل قصیدوں میں بجز جھوٹ خوشامد۔بیہودہ گوئی اور لغو مضامین کے اور کچھ نہیں ہوتا۔
قصیدوں سے فقیروں کی صدا کا کام لیا جاتا ہے۔قصیدہ گوئی کا مقصد و مطلب یہ ہے
کہ ممدوح کو احمق بنا کر اس سے کچھ روپیہ وصول کیا جائے۔ان لوگوں کی شاعری کسی
خاص کی قدردانی اور سرپرستی پر موقوف نہیں ہوتی بلکہ اپنے کلام کی وہ ملک سے
داد چاہتے تھے اور ملک اُن کو علیٰ قدر مراتب داد دیتا تھا۔شخصی سلطنتوں میں جس طرح اور شخصی
قوتیں اپنے کمال عروج پر نہیں پہنچ سکتی ہیں اسی طرح قوت متخیلہ اختراعی کو بھی اصلی معراج
نہیں ہوئی۔جس طرح ترقی علوم و فنون بادشاہ یا اراکین سلطنت کے ذوق و شوق پر
منحصر ہے۔اسی طرح شاعری کی ترقی بھی انہی کی مرضی کے مطابق ہوئی۔شاعری پر تو ایک

مصیبت اور پڑی کہ علاوہ ان کی مرضی کی پابندی کے اس کو ان کی پسند کے سامنے بھی گردن جھکانا پڑی۔ جس طرف سلاطین یا امرا کی طبیعتیں راغب ہوئیں خواہ وہ باتیں ممدوح تھیں یا مذموم۔ شعرا پر اُن کی تعریف فرض ہوگئی اور ان کو اپنی طبیعتوں کو اُسی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس ترکیب سے شاعری کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس کا اصلی جوش اور فطری ولولے فرو ہوگئے۔ وہ مثل ایک قالب بے جان کے رہ گئی۔ گو شعرا نے اس کو اپنی کارستانی کے تریاق سے زندہ رکھا مگر اس کے چہرہ پر مردنی چھاگئی میں یہ نہیں کہتا کہ ایسے زمانوں میں ایک بھی عالی حوصلہ بلند ہمت۔ اصلی شاعر پیدا نہوا ہو اس ناقص دنیا میں ایسا کوئی کلیہ نہیں جس کی کم و بیش مستثنیات نہ ہوں۔ مگر بحث عام حالت سے کی جاتی ہے اور خاص امور مستثنیات میں جگہ پاتے ہیں۔ شخصی سلطنت میں بھی بعض شعرا مثل فردوسی علیہ الرحمۃ اور سعدی علیہ الرحمۃ کے ایسے ہوگزرے ہیں جن پر تمام دنیا فخر کرسکتی ہے۔ اور تاریخ عالم میں ان کی نظیریں بہت کم ملیں گی۔ غرض ایسے ملکوں کے شعرا کی تعریف بے محل اور مدحت بیجا شعار ہوگیا۔ ان کے فن کی ترقی بڑے آدمیوں کے پسند و سرپرستی پر منحصر ہوگئی۔ اور شاعری بیچاری شعرا کے کسب معاش کا ذریعہ ٹھیر گئی مجبوراً ان کو اُن لوگوں کا تتبع کرنا پڑا اور اس فن شریف میں وہ پست و دنی خیالات پیدا ہوگئے کہ اس کو اپنے پایہ سے گرا کر چھوڑا۔ ان عیش پسند لوگوں کو سیدھی سادھی شاعری کا ہیکا و پسند آنے لگی۔ اب شاعری میں تشبیہ مع استعارات اور مبالغہ کی بھرمار شروع ہوئی۔ وہ خیالی مضامین شعرا تے دماغ سے اتارے کہ جن کو اصلیت اور واقعات سے کچھ بھی مس نہ تھا۔ یہ ایسی بدشکل بدمزہ بدذائقہ سڑی اور بساندی معجون تیار ہوئی کہ جس کے دیکھتے ہی سے صاحبان ذوق سلیم کے دل میں اس سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہوگئی۔

فی نفسہ شاعری ایک فن شریف و جوہر لطیف ہے۔ انسان کی ترقی میں اس کا

خاص حصہ ہے۔ اخلاق کی تہذیب اور تمدن کی اصلاح جس قدر اس کے ذریعہ سے ہوئی اور وسائل سے اس قدر نا ممکن تھی۔ یہ دنیا کے کاروبار میں اُس کے ساتھی اور تنہائی کے عالم میں اس کے مددگار رہے تھے۔ بیکسی میں بھی اس نے انسان کا ساتھ نہ چھوڑا اور مصیبت کے وقت میں اپنے آپ کو ایک سرچشمۂ تسکین ثابت کیا۔ لڑائی میں بھی اس نے کارنمایاں کئے۔ یہ مشہور ہے کہ ایک خاص لڑائی میں سپارٹا Sparta والے صرف ایک شاعر ہی کی مدد سے کامیاب ہوئے۔ اور اس تنزل کے زمانہ میں بھی یونان کی آزادی کا باعث یہ ہی شاعری ہوئی۔ لارڈ بایرن کی پُرجوش نظم سے ان کی حمیت کی رگ جوش میں آئی اور انہوں نے از سر نو اپنی آزادی حاصل کی۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ ہی عرب کا شعار تھا جنگ کے وقت ان کی عورات کچھ جوش دلانے والے اشعار گاتیں جس سے اُن کا دریائے شجاعت جوش زن ہوتا اور وہ اپنے دشمن کے مقابل ہوتے یا اُس پر فتح حاصل کرتے یا اپنی جانیں نثار کر دیتے۔ غرض وجدانیت شاعری کا پورا تسلط تھا۔ اس کے ذریعہ سے انسان کے فطری ولولے جوش میں آتے اور قدرتی جذبات کو حرکت ہوتی جس سے دنیا میں بڑے بڑے کام ظہور میں آئے۔ چونکہ شاعری کا ماخذ قوت متخیلہ اختراعی ہے پس ایک خاص حد تک شاعری کی خوبیاں خوبی رہتی ہیں مگر جب اُس میں انسان حد سے زیادہ منہمک ہو جاتا ہے تو وہ خوبیاں برائی کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔ اور شاعری سے اخلاق و دماغ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔

ایک شخص جو اکثر خیالی عجائبات کی سیر میں مصروف رہتا ہے۔ اس کو زندگی کے واقعات نفس الامری سے تشفی نہیں ہوتی بلکہ وہ خیالی باتوں کو سرچشمۂ تسکین سمجھنے لگتا ہے۔ اس کو روزمرہ کی سچی تحریک دلانے والے وسائل پھیکے اور بدمزہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور حقائق سے بالکل دلچسپی نہیں رہتی۔ ہمدردی سنگین دلی کے ساتھ بدل جاتی ہے اور خود غرضی انسان کے دل کا قبضہ کر لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اچھا خاصہ شیخ چلی ہو جاتا ہے۔ یہ نقصانات ہیں جو

اخلاق کو پہنچتے ہیں۔ دماغ کو جو صدمات ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ حد سے زیادہ قوت متخیلہ کی مصروفیت سے سچے واقعات اور جھوٹے اختراعات میں کچھ مابہ الامتیاز باقی نہیں رہتا اور دونوں کی مختلف شکلیں بالکل مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ خیالات روشن کا اعتقاد ہمعنان ہوتا ہے۔ زیادہ مصروفیت سے خیالی باتوں میں حقانیت پیدا ہو جاتی ہے اور اعتقاد کو استحکام ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جنکو مبدٔہ فیاض سے اعلیٰ قسم کی قوت متخیلہ عطا ہوئی ہے اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ان کے خیالات اور ان کے اختراعات و واقعات اور حقائق کے ہم پلہ ہیں۔

اردو زبان کی شاعری

اس بات کی چھان بین کرنا کہ اردو زبان نے کیا اور کن وجوہ سے جامۂ ہستی پہنا اور کس کس زمانہ میں اس میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ہماری بحث سے علیحدہ ہے۔ یہاں اس قدر کہدینا کافی ہے کہ اس زبان نے "سنسکرت کی زمین میں فارسی کی آب و ہوا سے نشوونما پائی"۔ اگرچہ نظم لکھے جانے کے بہت قوی اسباب موجود نہ تھے مگر پھر بھی حسب دستور نظم ہی نے پہلے پہل اس زبان پر قبضہ کیا اور جس طرح ہر ملک میں شاعری کی ابتدا اور اسکا عروج زمانۂ جہالت میں ہوتا ہے اسی طرح اردو شاعری کا ستارہ بھی اُس وقت طالع ہوا جب مشرقی علوم کی شمع چراغ سحری تھی بلکہ گل ہو چکی تھی۔ اور ہنوز نئی روشنی کا آفتاب اُفق مغرب سے طلوع ہوا تھا۔ اُس کا عروج اُس وقت ہوا جب کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا۔ مگر ابھی تک ایک عالم خواب جہالت سے نہ چونکا تھا۔

متقدمین شعرائے اردو کو بھی کسی نئی چیز کے ایجاد کرنے کا فخر حاصل نہیں ہے۔ البتہ ان کو خیالات کے مترجم ہونے کی عزت حاصل ہے۔ ان لوگوں نے براہِ راست قدرت سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اور نہ اپنی شاعری کے لئے کوئی جداگانہ قواعد مقرر کئے۔ ان کے

واسطے فارسی شاعری کی سڑک تیار تھی یہ آنکھیں بند کر کے اُسی سڑک پر ہو لیئے۔ فارسی شاعری کو اپنی شاعری کا پیمانہ جانکر اُسی کا تتبع کرنے لگے فارسی میں جو اقسام شاعری تھے انہیں پر اُردو نظم کو بھی منقسم کیا۔ اُسی زبان سے بحور اور زبان عاریتاً لیئے وہی صنائع اور بدائع اپنی شاعری کے لیئے قرار دیئے۔ قوافی و دیگر قیود نظم میں بھی اُسی زبان کا چربہ اُتارا۔ غرض جو تقلید کے معنی ہیں وہ پوری طرح سے ادا کیئے۔ اُردو شاعری کو بچپن ہی سے روگ لگ گیا۔ یہ بچہ ابھی اچھی طرح چلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے پاؤں میں موٹی اور بھاری زنجیریں پڑ گئیں۔ اس وجہ سے اس زبان میں قدرتی شاعری کا پتہ نہیں۔ مصنوعی شاعری البتہ موجود ہے۔ اُس میں نہ فطری جوش ہے اور نہ قدرتی ولولے۔ وارنش کیئے ہوئے شعراء کے پُرانے خیالات موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس خاص لائن میں انہوں نے نمایاں ترقی کی۔ اور بعض بعض معاملات میں اپنے اُستادوں سے گوئے سبقت لے گئے۔

اور قیود کو نظر انداز کر کے صرف قافیہ کو ملاحظہ کیجیئے۔ اس سے شاعری کی اصلی ترقی کو سخت نقصان پہونچا۔ بیشک خاص خاص موقعوں پر قافیہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ مگر اسی درجہ کی شاعری میں یہ مانع حسن کلام ہے۔ کسی شاعر کی طبیعت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اس کے اشعار سے کبھی ممکن نہیں کیونکہ وہ جس طرح چاہتا ہے اپنے خیالات کو ادا نہیں کر سکتا بلکہ اپنی طبعی جوش کو روک کر پہلے اس کو قافیہ تلاش کرنا ہوتا ہے اور پھر جس مضمون کو قافیہ چاہتا ہے وہی اس کو اکثر اپنی مرضی کے خلاف لکھنا پڑتا ہے پھر قافیہ کوئی آسان چیز نہیں یہ ایسی مشکل شئے ہے کہ ایک جداگانہ علم قرار پاگیا ہے جس میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جس طرح شاعری کا قافیہ سد راہ ہے اُسی طرح قافیہ کی وسعت کو ایطاء جلی اور ایطاء خفی اور اسی طرح کی دوسری بحروں نے محدود کیا ہے۔ ایک شاعر بہت ہاتھ پاؤں بچا کر کچھ لکھتا ہے۔ اس کے خیالات کی شکل مسخ ہو جاتی ہے۔ آمد آورد بن جاتی ہے۔ اور پھر بھی کلام عیوب شاعری سے پاک نہیں ہوتا۔ تھوڑے اشعار اور معمولی خیالات میں قافیہ نبھ سکتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی

مسلسل اور طولانی نظموں میں اس کی پابندی سخت مشکل ہے مگر اردو میں قافیہ کی یہاں تک پابندی کی گئی ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی پایہ کی بڑی نظم نہیں لکھی گئی۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ بعض حوصلہ مند طباع و ذکی لوگوں نے باوجود اس سخت قید کے ایسے اشعار لکھے ہیں کہ جن کے سننے سے طبیعت وجد کرتی ہے اگرچہ ان سے بھی کوئی عمدہ دلچسپ دل کی بیچین کرنے والی پُرمغز مسلسل۔ طولانی نظم نہیں لکھی گئی۔ ایسی نظم کی اُردو میں بہت ضرورت ہے جس کے بغیر اس زبان کی شاعری ناکمل ہے۔

دوسری مصیبت اُردو شاعری میں رعایت اور ضلع ہے۔ یہ ایسا عام مرض ہے کہ اس سے کسی زبان کی شاعری محفوظ نہیں اور غالباً تمام ملکوں کے بڑے بڑے سخن سنج اور سخن فہموں کو اس نقص کا اعتراف ہے۔ اُردو کا ذکر بالتخصیص اس غرض سے کیا گیا کہ مضمون ہذا کی شق ثانی کی سُرخی اُردو شاعری ہے۔ علاوہ اس کے اُردو شاعری میں رعایت کی رعایت اس درجہ کی جاتی ہے کہ شاعر کو نفس مضمون کا مطلق خیال نہیں رہتا اور بیچارہ رعایت کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس خاص معاملہ میں شاعر ہی کا قصور نہیں وہ بھی غریب مجبور ہے۔ ملک کا مذاق ہی ایسا بگڑا ہوا ہے کہ سادگی لوگوں کو پسند ہی نہیں۔ اکثر شاعروں کو دیکھا گیا ہے کہ سلیس۔ صاف اور پُرمطلب شعر کی کوئی داد ہی نہیں دیتا۔ مرصع پیچیدہ۔ اور لغو شعر پر وہ ہنگامہ برپا ہوتا ہے کہ کان کے پردے پھٹنے لگتے ہیں پس کچھ تو شعرا کی طبیعتیں رعایت پسند اور کچھ ملک کا مذاق رنگین۔ اونگتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ شاعروں نے وہ وہ پُر رعایت شعر نکالے کہ جن سے عوام کے مذاق کو کسی قدر مدد ملی مگر صاحبانِ ذوقِ سلیم کو خود شاعری ہی سے ایک قسم کی نفرت ہو گئی۔ رعایت کے بھی دو پہلو ہیں ایک اچھا اور ایک بُرا۔ اچھا پہلو یہ ہے کہ کسی شعر کے الفاظ میں رعایت بیساختہ طور پر واقع ہو۔ اور اُس میں بناوٹ نہ پائی جائے ایسی رعایت شعر میں ایک خوبی پیدا کر دیتی ہے۔ مگر اس کا عکس یعنی ایسی رعایت جس میں بالکل تصنع پایا جائے۔ اور جس کی خاطر سے کوئی شعر گڑھا جائے۔ بدنما معلوم ہوتا ہے عمدہ قسم

کی رعایت کی ایک یہ بھی پہچان ہے۔ اگر اس شعر کو جس میں رعایت ہو کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے تو اُس رعایت کی خوبی نہ بگڑے ورنہ وہ رعایت ہیچ ہے۔

شاعری کے دلچسپ ہونے کے جو اسباب ہوتے ہیں اُن میں سے اُردو شاعری میں ایک بھی موجود نہیں۔ نہ اُس میں حُسنِ قدرت کی تعریف ہے۔ اور نہ وہ مختلف انسانی خیالات کا آئینہ نہ اُس میں اخلاقی مضامین ہیں اور نہ تمدنی معاملات نہ اُس میں تاریخی باتیں ہیں اور قومی حالات عشقیہ مضامین کی یہ شاعری ایسی گرویدہ ہے کہ گویا اس میں دوسرے مضامین کی کھپت ہی نہیں۔ اس کے مطالعہ سے اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ایک زمانہ ہوا برست ہے اور سب کے سر پر عشق کا جن چڑھا ہوا ہے عشق کا بھی اگر سچا فوٹو کھینچا جائے تو کچھ کم نہیں ہے۔ مگر بالکل بے سرو پا باتیں انسان کے دل پر کیا اثر رکھ سکتی ہیں۔ جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے سامنے ایسی تصویریں ہیں جو اس دُنیا کے باشندوں سے کچھ مشابہت نہیں رکھتیں تو ہم کو کچھ تحریک نہیں ہو سکتی بلکہ اُن سے ایک قسم کی ہیبت سما جاتی ہے جو ہمارے اصلی جوش کو فرو اور ہمارے زندہ دل کو مردہ بنا دیتی ہے۔

ہمارے شاعروں نے جب دیکھا کہ ان کا معشوق (یعنی شاعری) سادگی کی خوبیوں سے قطعی عرا ہے تو انہوں نے اس کے واسطے تشبیہ اور استعارات کا زیور تیار کیا اور اس کو اس ترکیب سے سنوارا کہ اس کے ساتھ لوگوں کو ایک قسم کی دلچسپی ہو گئی۔ اسی پر انہوں نے اکتفا نہیں کیا بلکہ اس زیور سے اس کو ایسا لاد دیا کہ اس کی اصلی شکل بالکل چھپ گئی اور نزاکت کے بجائے اس میں ایک طرح کا بھدا پن آگیا۔ گو معمولی آنکھ اس نقص کو نہ دیکھ سکی مگر نظر باز نگاہ پر اس کی قلعی کھل گئی گو ان کو قدرتی شاعری سے حصہ نہیں ملا۔ مگر مصنوعی شاعری کو درجہ کمال پر پہونچا دیا۔ اُنہوں نے خیالی بنیاد پر ایک شاندار خیالی عمارت چُنی جو خیالی دنیا کے رہنے والوں کے لئے ایک دلکش نظر فریب اور قابلِ قدر چیز ہے۔ چونکہ اس شاعری کی بنیاد ہی واقعات پر نہیں ہے تو شعرا نے اس کو غیر قدرتی بنا دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ تشبیہ اور استعارات تو موجود ہی تھے

اس پر مبالغہ کو اور اضافہ کیا۔ اور مبالغہ بھی کوئی معمولی مبالغہ نہیں بلکہ انتہا درجہ کا مبالغہ۔ ان کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کے خیالات نہیں بلکہ وہ کسی ایسے شخص کے خیالات ہیں جو عالم بالا کا رہنے والا ہے۔ اور وہ انسانی طبیعت انسانی جذبات انسانی معاملات کو مطلق نہیں سمجھتا۔ ہمارے شعرا نے مبالغہ میں یہاں تک دستگاہ حاصل کی ہے کہ ان میں اور ایک مجنوں میں صرف اس قدر فرق ہے کہ وہ جو کچھ بکتا ہے اس کے سچ ہونے کا بھی یقین رکھتا ہے اور یہ جو کچھ فرماتے ہیں اس کو سچ نہیں سمجھتے۔ اگر یہ فرق بھی اُٹھ جائے تو ایک شخص کو شاعر اور پاگل کی شناخت میں سخت دقت واقع ہو۔

اُردو نظم کی چار بڑی قسمیں ہیں۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ مرثیہ۔ ان چاروں پر میں علحدہ علحدہ ریمارک کروں گا۔ ہمیشہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں مثنوی ایک اعلیٰ درجہ کی نظم خیال کی گئی ہے۔ معمولی شعرا کے خیال کی پرواز سے اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ ہر ملک میں مثنوی پر ایسے شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ جو اُس زمانہ اور اُس ملک میں اپنا ہمسر نہیں رکھتے تھے۔ اور جن کی نکتہ سنجی اور بلند پروازی مسلم ہوتی تھی۔ اور جن کے معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع ہوتا تھا اکثر ان میں کے بڑے جلیل القدر عالم تھے اور بڑے نامور حکیم تھے اس کلیہ کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مثنوی ایک مسلسل طولانی اور پُر مغز نظم ہوا کرتی ہے۔ اس کا مضمون نہایت اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ اس میں تاریخی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ قومی۔ سچے عشقی معاملات فلسفیانہ طور سے ادا کیے جاتی ہیں۔ تمام دنیا کی بڑی بڑی مثنویوں میں ایسے ہی حالات ہیں۔ اُردو زبان میں اول تو مثنویاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اور جو لکھی گئی ہیں اُن میں ایسی باتوں کا کہیں پتہ بھی نہیں کسی جھوٹے اور لغو قصے کو شعرا نے نظم کر دیا جن لوگوں کا مثنویوں میں ذکر ہے وہ شاید کبھی اس دنیا میں پیدا بھی نہیں ہوئے فرضی اشخاص مان لئے گئے اور اُن کی طرف فرضی باتیں منسوب کر دی گئیں۔ اس پر ایک اور غضب یہ کہ سوائے جھوٹے عشقی باتوں کے اور ان میں کچھ نہیں۔ اس پر بھی اس زبان میں دو ایک مثنوی ایسی ہیں جو وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ اُن سے اور کچھ نہیں تو شعرا

کی زبان کی شستگی خیالات کی پختگی ان کی طبیعت کی روانی جھوٹ کو سچ دکھانیکی قابلیت پائی جاتی ہے۔ بیشک جھوٹ کو سچ کر دکھانا ہمارے اولوالعزم شاعروں ہی کا کام ہے۔

قصیدہ۔ یہ قسم نظم ننگ شاعری ہے۔ معدودے چند قصیدوں کو چھوڑ کر جو بزرگان دین کی شان میں لکھے گئے ہیں اور سب قصائد بادشاہ امرا اور دولت مند لوگوں کی شان میں تصنیف ہوئے ہیں۔ کچھ تو ممدوح خوشامد پسند اور کچھ مداحوں کو ان سے وصول کرنا منظور۔ اس سبب سے قصیدوں میں دروغگوئی کذب خوشامد سے وہ کام لیا ہے کہ الامان۔ ایک قصیدے کو پڑھکر کوئی عقلمند یہ نہیں بتلا سکتا کہ اس میں کس قدر سچ ہے اور کس قدر جھوٹ۔ دونوں کی اگر نسبت نکالی جائے تو شاید سچ اتنا ہو جتنا آٹے میں نمک۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ کسی شکستہ حال رئیس کا اگر جمشید کو دربان سکندر کو غاشیہ بردار بنایا تو سمجھے کچھ تعریف نہوئی۔ کسی کم۔ ورکو اگر رستم ثانی کسی بخیل کو اگر حاتم کا جواب۔ کسی ظالم کو نوشیروان وقت ٹھیرایا تو اس کے لئے ہجو کی۔ کیونکہ مبالغہ کی بدولت یہ نامہائے نامی ایسی چیز ہوگئے ہیں کہ ان کو خادم بنا دینے سے بھی کچھ ممدوح کی عظمت نہیں ثابت ہوتی۔ ہاں ممدوح میں اگر انبیاء نہیں بلکہ خدا کی صفات ثابت کئے جائیں تو سمجھئے کہ کچھ تعریف ہوئی۔ الغرض اگر غور سے دیکھئے تو قصیدہ سے ممدوح کے صفات پر الٹا پردہ پڑجاتا ہے۔ اور اگر خود ممدوح اپنی مدح پڑھے اور ذرا تامل کرے تو معلوم ہوجائے کہ اس کو کس قدر بنایا گیا ہے۔ اور اگر ذرا غیرت کو بھی کام فرمائے تو بیچارہ کو مرنا پڑے کیونکہ نہ وہ صفات اس میں موجود ہوں گی اور نہ وہ اپنے آپ کو جینے کے قابل خیال کرے گا۔ ہمارے شعرائے جھوٹ اور خوشامد کو اپنے فرائض منصبی میں داخل سمجھ لیا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ایسی ہزلیات سے شاعر کا رتبہ بہت بلند ہے۔ اس کو خلاصۂ وقت اور وکیل زماں ہونا چاہئے اور اس کے کلام کو اس وقت کے خیالات کا آئینہ۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ قصیدہ گوئی کوئی آسان کام نہیں بڑے بڑے نامی شعرائے قصیدہ لکھے ہیں۔ اگر کہیں چھوٹی امت کے لوگوں کو بھی قصیدہ لکھنے پر دسترس ہوتا تو خدا جانے بیچاری شاعری کی کیا گت ہوتی۔

غزلیات کی اس شاعری میں وہ کثرت ہے کہ گویا غزل گوئی شاعری کا مرادف ہوگئی ہے
اگر کوئی شخص ایک شاعر کی اپنی دستی تصویر کھینچے تو وہ لباس غزل گو میں اس کو دکھلائی دیگا۔
غزل میں کچھ ہجر کی آفت وصال کے اشتیاق انتظار کی مصیبت وغیرہ وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے
اس خاص شاخ میں شعرا نے نمایاں ترقی کی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اول تو
غزل کے اشعار کم ہوتے ہیں۔ اور پھر ان میں کچھ علاقہ نہیں ہوتا۔ یہانتک بے تعلقی بڑہی ہوئی
ہے کہ دو شعروں کے مضمون میں بھی مطابقت نہیں ہوتی۔ ایک شعر میں معشوق کی زلف
کی تعریف ہے تو دوسرے میں ہجر کی مصیبت کا ذکر ہے تیسرے میں وصال کی امید کا اظہار
چوتھے میں انتظار کی تکالیف کا بیان۔ پانچویں میں معشوق کی بیوفائی کی شکایت۔ غرض مطلع
سے مقطع تک مختلف مضامین ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ معمولی باتیں بھی اس غیر قدرتی طور سے جو
اس شاعری کا خاصہ ہے ادا کی گئی ہیں۔ مگر ایک خیال نہایت ہی تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے
ہمارے شعرا اپنے معشوق کو اس درجہ بیوفا باندھتے ہیں کہ اس کو دوسروں کا عاشق گردانتے
ہیں اور اپنی طرف اس کی کم التفاتی کی شکایت کرتے ہیں۔ اور باوجود اس کی بے اعتنائی کے
خود مرے چلے جاتے ہیں۔ اس ناپاک مضمون میں عجیب عجیب باریکیاں نکالی گئی ہیں
سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے ہرجائی معشوق کے وہ کیونکر گرویدہ ہیں۔ اور اس کی تعریف میں
ان کی طبیعت اور زبان کیونکر یاری دیتی ہے۔ بظاہر اس کے دو سبب معلوم ہوتے
ہیں اول تو ہمارے شعرا جھوٹے عاشق ہوتے ہیں۔ اور اس وجہ سے انکا جذب عشق
کچھ تاثیر نہیں رکھتا

دوم پردہ کی عمدہ رسم کی وجہ سے عام طور پر اظہار عشق کا موقع نہیں ملتا۔ مجبوراً وہ ارباب
نشاط کے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس قوم کی بیوفائی ضرب المثل ہے۔ یہی رسم
پردہ جیسا کہ خواجہ الطاف حسین حالی سلمہ اللہ تعالیٰ نے حیات سعدی میں فرمایا ہے۔ اظہار
امرد پرستی کا بھی باعث ہوئی۔ اس زمانہ میں غزل گو شعرا کی وہ افراط ہے کہ بیچاری غزل کا

بھی قافیہ تنگ ہے جس کو دیکھئے اس خبط میں گرفتار ہے۔ خداوند کریم اس وبائی مرض کو جلد دور کرے اور لوگوں کو اس کے چنگل سے نجات دے۔ آمین۔

مرثیہ اگرچہ ہر واقعہ جانکاہ کے بیان کو کہہ سکتے ہیں۔ مگر اُردو زبان میں یہ جناب امام حسین علیہ السلام کے حالات اور معرکہ کربلا کے پُر حسرت اور افسوسناک واقعات کے ساتھ مخصوص ہے مذہبی خیالات کو علیحدہ کرکے بھی دیکھا جائے تو اُردو میں صرف یہی ایک قسم شاعری ہے جس میں اعلیٰ مضامین ادا کئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس میں بھی تشبیہ اور استعارات کی افراط ہے اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں حد سے زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ مگر اس نقص کی رعایت کے بعد بھی مرثیہ اپنے بلند پایہ سے نہیں گرتا۔ وہ ایک کلام جامع ہے جس میں ہر قسم کے مضمون سے انسان لطف اُٹھا سکتا ہے۔ اگر مرثیہ کو شاعری سے جدا سمجھا جائے تو اُردو شاعری بہت ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ فخر شعرائے ہند میر انیس مرحوم کو فصاحت۔ بلاغت شستگی۔ زبان کی پاکیزگی خیالات۔ متانت و سنجیدگی بیان۔ انوکھی طرز ادا۔ دلکش الفاظ۔ سلجھی ہوئی ترکیبوں۔ نکھری ہوئی بندشوں کے لحاظ سے اور نیز انسانی خیالات کی واقفیت اور عمدہ منظروں کی دلچسپ تصویر کھینچنے کی وجہ سے دنیا کے مشہور شعرا میں بلند مرتبہ حاصل ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں اور اُن اقوام کے جن کو اس زبان سے تعلق ہے تنزل کے اسباب میں سے اگر غور کیا جائے تو ایک بڑا سبب شاعری معلوم ہوگی۔ یہ تو ایک مسلم بات ہے کہ ہمارے شعرا دنیا کے کسی کام کے بھی نہیں گویا اُن کا وجود ہی عبث ہے۔ مگر میری رائے میں وہ محض ناکارہ نہیں ہیں۔ شاید وہ ہمارے تنزل کو ترقی دینے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور اس میں اُن کو پوری کامیابی ہوئی۔ اُدھر جوانی کا بھوت سر پر چڑھا اور اُدھر ہمارے اس جنوں خیز لٹریچر پرو ستر س ہونے سے نوجوانوں کے خیالات میں دونی شورش پیدا ہوگئی انکے اخلاق اور دماغ کو ملکی اور تمدنی حالات کو سخت صدمے پہنچے اُنکے قوائے بہیمی کو اس درجہ مدد ملی کہ وہ لفظ انسان کے مفہوم سے خارج ہوگئے۔ اخلاق اور دماغ کو وہی نقصانات

پہنچے جنکا ذکر میں مضمون ہذا کی شق اول کے اخیر میں کر چکا ہوں چونکہ ہماری شاعری کی بنا خیالی۔ جھوٹے عشقیہ مضامین پر ہے اس سبب سے اخلاقی قوتیں اور ذہنی قویٰ بہت ہی کمزور ہو گئے اور یہ کمزوری دنیا کے کاروبار میں بہت حارج ہوئی۔

ہمارے ملک کی حکومت خدا نے ایسی قوم کو دی ہے جس کے اکثر افراد حکیم۔ فلسفہ داں مورخ۔ طبیعات کے موجد حقائق پسند ہیں۔ اور اُن کی عمدہ زبان اُن کے خیالات کا آئینہ جب یہ ملک ان لوگوں کے تصرف میں آیا اُن کی زبان رموزِ سلطنت کے سمجھنے کا ذریعہ اور کسب معاش کا وسیلہ آن ٹھہری۔ ملک میں نئی قسم کی تعلیم جاری ہوئی۔ اب تواریخ۔ جغرافیہ۔ ریاضی فلسفہ منطق۔ طبیعات کے درس ہونے لگے۔ یہ خواہش تو ہمارے دل میں کاہے کو ہونے لگی کہ رموز سلطنت کے سمجھنے کی قابلیت پیدا کرتے اور مشیر دولت بننے کی غرض سے تحصیل علوم میں مصروف ہوں۔ مگر کسب معاش نے ان علوم کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کیا۔ طوعاً و کرہاً پڑھنے لگے تو تازہ مصیبت سر پر آئی۔ تعلیم سارے مذاق کے خلاف نہ اُس میں مضامین دلچسپ قصے عشقیہ پھڑکتے ہوئے اشعار نہ زلف کی تعریف نہ کمر کا ذکر۔ ایک مصیبت ہو تو بیان کی جاوے۔ ہم خوگران پاک مضامین کی وہاں یاد کرنا پڑیں پھیکے تاریخی حالات لمبے ٹیڑھے بیہودہ جغرافیہ کے نام۔ ریاضی کے اصول۔ فلسفے کے مسائل۔ طبیعات کی ناکارہ باتیں تاریخ جغرافیہ کو تو خیر رٹ بھی لیں مگر ادق مضامین کے سمجھنے کو دماغ کہاں سے لائیں۔ دماغ ایسے ٹھوس ہوئے طبیعتیں ایسی نارسا ہوئیں کہ بیچارے سید احمد خان کو مضمون لکھوانے پڑے۔ یہ ساری آفتیں اس شاعری کی بدولت نازل ہوئیں اس کا اندازہ وہ شخص کر سکتا ہے جسکو انگریزی پڑھنے کا کام اس وقت پڑا ہو جبکہ اس کمبخت شاعری کا رنگ اس کی طبیعت پر چڑھ چکا ہو۔

جب ہم عقل کو کھو بیٹھے ہر قسم کی تعلیم سے عموماً اور انگریزی تعلیم سے خصوصاً محروم ہوئے۔ تو ملکی خدمات نے بھی ہم سے کنارہ کیا۔ ملکی خدمات ملنا موقوف ہوا تو افلاس نے گھیرا۔

افلاس میں گھرے تو بغض حسد، کینہ نفاق - اور تمام کینہ خیالات پیدا ہوئے - اب آئے دن کی لڑائی جھگڑے ہونے لگے - ایک کو دیکھکر ایک جلنے لگا - ممنوعات شرعی کا اس زور و شور سے رواج ہوا کہ شیاطین بھی ہماری سوسائٹی سے پناہ مانگنے لگے - ان ساری مصیبتوں کے اور بھی اسباب ہوں گے مگر شاعری کا بھی ان میں بہت بڑا حصہ ہے -

خدا کا شکر ہے کہ بعض بزرگوں کے شور و غل نے لوگوں کو خواب غفلت سے چونکایا ہے اور انہوں نے اپنی اولاد کو سیدھے راستہ پر لگانا شروع کیا ہے - یقین ہے کہ اگر وہ ایسا کئے گئے تو کچھ عرصے کے بعد قوم کی حالت سنبھل جائے خدا قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں سچا مذاق پیدا کرے اور ان کو شاعری کے پھندے سے محفوظ رکھے -

لوازم شاعری

از خان بہادر جناب مولوی سید علی محمد صاحب شاؔد آنریری مجسٹریٹ پٹنہ

بہت ہیں نظم کے بارے میں مختلف رائیں
کسی کا قول ہے کچھ اور کسی کا کچھ دعوا

کوئی تو کہنہ روش کو پسند کرتا ہے
کسی کی طبع ہے طرز جدید کی شیدا

ہماری رائے ہے اس باب میں غرض جو کچھ
خلاصہ اُس کا ہم اس جا پہ کرتے ہیں املا

مقدم اس میں ہے خود شاعروں کی چھان بنان
کہ شاعری کسے موزوں ہے کس کو نا زیبا

تو حق یہی ہے کہ شاعر ہو فطرتی شاعر
بغیر کسب کے ہو جوش اُس کے دل میں بھرا

طبیعت اُس کی ہوئے اختیار مائل نظم
ہو سر میں سکال مشکین نظم کا سودا

غرض سے پاک ہو یہ عشق فطرتی اُس کا
کہے بغیر نہ چین آئے طبع کو اصلا

تعلق اُس کو ہو طبعی کلام موزوں سے
کہے جو شعر تو سامع کی بھی نہ ہو پروا

رؤس علم سے بھی باخبر ہو حتی الوسع
فنون شعر یہ حاوی ہو اُس کی طبع رسا

علاوہ علم کے ادراک میں بھی تیزی ہو — رہیں بیاں کے نتائج پہ اس کی آنکھیں وا

ضرورتوں سے بھی آگاہ ہو زمانے کی — مذاقِ ملک سے بھی بے خبر نہ ہو اصلا

میسر آئی ہو سب طرح کی اسے صحبت — ملا ہو سب سے اُدانی سے لیکے تا اعلا

طبیعت اس کی تعصب سے اجتناب کرے — گداز ہو دلِ عاشق مزاج بھی اس کا

ہو اختلافِ مذاہب پہ بھی نظر حاوی — خصوص ہو فنِ تاریخ میں یدِ طولا

تو ایسے شخص کو لازم ہے شاعری کرنا — رہے وہ غرق جو تکمیل میں تو ہے زیبا

یہ نعمتیں جسے دی ہوں خدا نے از رہِ فضل — اگر وہ اس میں ریاضت کرے تو ہو کیا

مگر بہت سے ہیں اس راہ میں خس و خاشاک — ہو دیکھ بھال کے وادیٔ نظم میں پویا

رہی یہ بات کہ طرزِ کلام کیسا ہو — کہ اہلِ فہم کہیں جس کو واقعی اچھا

صفت کلام کی تفصیل و شرح و بسط کی ساتھ — فنِ بیاں کی کتابوں میں ہے رقم ہر جا

ضرورت اس کے بیاں کی نہیں ہے اس جا پر — فہیم کے لئے کافی ہے بس یہی نکتہ

کہ سب سے بڑھ کے سخن میں ہے صنعتِ تشبیہ — کئی اسی کے ہیں اقسام منضبط ہر جا

ادیب لازم معنی پہ سب کے غور کرے — کہ واسطے ہیں کم ان معنیوں میں یا کہ سوا

اگر ہیں لازم و ملزوم میں وسائط کم — تو ایسی شکل سے تشبیہ میں ہے لطف سوا

وسائط اس میں پڑے ہیں جس طرح کثیر رہا د — تو اس سے ہوگا پراگندہ فہم سامع کا

خلاصہ یہ کہ بہت دور کی نہ کوڑی لائے — کہ سننے والوں کو اک انزجار ہو پیدا

نہیں لطیف وہ تشبیہ غیر حسی بھی ہو — مشبہ بہ ہو فقط جس میں وہم سے پیدا

یہی ہے رائے کنایات و استعارے میں — کہ جس میں لطف نہ ہو اس سے اجتناب اولا

مبالغے میں بھی تبلیغ ہو کہ ہو اغراق — نتیجہ ہو جو مؤثر تو شعر میں ہے روا

غلو کے باب میں ہے رائے برخلاف مری — کہ اس سے کوئی نتیجہ نہیں عجب کے سوا

اسی طرح جو صنائع خلافِ فطرت ہوں — کبھی لطیف نہیں نظم و نثر میں حاشا

وہ صنعتیں جو حقیقت کو مشتبہ کردیں — کریں گے قطع نظر ان سے بالیقیں عقلا

اسی پہ ختم میں کرتا ہوں بحث معنی کو — کہ ہیں بھی ایسے صنائع میں مختلف حکما

رہی صنائع لفظی تو وہ بھی ظاہر ہے — کہ لفظ پر ہے مقدم لطافت معنیٰ

خلل صنائع لفظی سے جب ہو معنی میں — تو اہل ذوق پہ لازم ہے ترک تام ان کا

نہ یہ کہ لفظ میں ہو جائیں منہمک ایسے — کہ اصل حاصل مضموں کی بھی نہ ہو پروا

یہ مانتا ہوں کہ وسعت نہیں ہے اردو میں — کچھ اور تنگ کریں اس کو یہ نہیں زیبا

چڑھے ہوئے ہوں زبانوں پہ سب کی جو الفاظ — لغت کو ڈھونڈھ کے صحت سے اسکی مطلب کیا

یہی کہ اصل زباں ہے اس طرح یہ لغت — محاوروں پہ یہ ایراد بے محل کیسا

وہ لفظ جس کی ہو شہرت فقط گنواروں میں — نہ بولتے ہوں جسے بھول کر کبھی شرفا

وہ لفظ جس کی رکاکت ہو بہ ملا ظاہر — سنیں تو ہوں متبسم یہ زیر لب فصحا

وہ لفظ صرف جو ہو اہل سوق میں رائج — وہ لفظ جس سے نہ مانوس ہوں کبھی شعرا

وہ لفظ صرف جو ظاہر میں خوشنما ہو مگر — گھٹے کچھ اور بھی جس سے لطافت معنیٰ

وہ لفظ ترک کیا ہو جسے فصیحوں نے — بجائے نشۂ بالفتح جس طرح سرشا

تو ایسے لفظ کا حکماً بہت ضرور ہے ترک — لگے نہ تا کہ فصاحت میں نظم کی دھبّا

بعینہٖ یہی حالت ہے ایسے لفظوں میں — کہ جن سے کچھ نہیں مطلب رعایتوں کے سوا

پہ چلے عبارت اردو میں اہل فارس کی چال — کہ تا نہ صورت ظاہر ہو اس کی نازیبا

کئی زبانوں سے مل کر بنی تو ہے اردو — زیادہ اس میں فقط فارسی ہے یا بھاشا

زبان فارس کی تحصیل سب سے اقدم ہے — بغیر اس کے کوئی اسکو لکھ نہیں سکتا

بہت ضرور ہے اردو کو فارسی دانی — نہ جانتا ہو جو بھاشا تو کچھ نہیں پروا

جدا کرنے بھی اگر کوئی فارسی سے اسے — یہ لاعلاج تعلق مٹا نہیں سکتا

اسی لئے ہے تتبع بھی فارسی کا ضرور — خراب ہوگا بغیر اس کے نظم کا خاکا

مگر تسجیع لفظی کی صرف حاجت ہے | کچھ اس قدر نہیں لازم تسجیع معنے
جہاں تلک ہے مری دستگاہ اس فن میں | مجھے پسند ہے انداز اہل یورپ کا
قلم سے لیتے ہیں وہ لوگ جو قلم کا کام | اُتار لیتے ہیں گویا وہ ہو بہو نقشا
مبالغہ ہے نہ اغراق اُن کے مضموں میں | وہ صنعتیں نہیں جو واقعی ہیں بے سر و پا
وہ جانتے نہیں اعلی کا آم کر دینا | جسے سمجھتے ہیں معراج ادب کے سب شعرا
بیاں ہیں اُن کے اثر خیز لفظ سب شیریں | کہ جس کے سُنتے ہی سامع کو جوش ہو پیدا
نمک کلام میں اتنا کہ اہل ذوق ہوں خوش | بلیغ اصل مضامیں سلیس طرز ادا
بعینہٖ مگر اُن کی ضرور کیا تقلید | کہ مقتضٰے بھی تو ہر ایک ملک کا ہے جدا
ہر ایک چیز کو اس کی جگہ پہ غور کرو | کہ مقتضائے طبعی ہے اس جگہ کا کیا
یہاں کا ذوق سلیم اس کو جب کرے تسلیم | تو ویسی بات کی تقلید ہو سکے گی روا
وہ شے تو خوب ہو لیکن بحالتِ تقلید | وہ رنگ و روپ سلامت نہ رہ سکے اصلا
مزید یہ کہ نہ ہو مقتضائے طبعی ملک | پھر اہل ذوق بھی اُس کا اُٹھا سکیں نہ مزا
اُتارنے کو اُتاری اُس اصل کی یوں نقل | کہ اصل شے کا بھی بالکل بدل گیا نقشا
تو ایسی نقل کا حاصل نہیں بجز اس کے | کہ اصل شے سے بھی ہو اہل ذوق کو ایرا
رہی یہ بات کہ اُردو کی نظم کیسی ہو | کہ خاص و عام کے دل پر اثر کرے پیدا
تو اس میں رائے وہی صاف صاف ظاہر ہے | سیاق نظم کو دیکھو میں کہہ رہا ہوں کیا
مذاق ملک کو سمجھے ضرورتیں دیکھے | کرے وہ امر جو ہو مقتضٰے زمانے کا
محاوروں میں دل آویزی و متانت ہو | مفید خلق ہو مضمون و حاصل معنے
بیان کرے جو کوئی بات نظم میں اپنی | تو اصل حال کی تصویر کھینچ دے گویا
طریق نظم سخن کا وہ اختیار کرے | کہ مان لیں اسے طرز قدیم کے شعرا
غزل میں صرف کرے حسن عشق کے مضمون | نصیحتیں بھی رہیں گو نہ اسکی ہوں شیدا

یہ حسن و عشق مجازی نہ ہو حقیقی ہو
اگر مجاز کا پہلو بھی ہو تو ایسا ہو
جو ہوں ادب کے مخالف وہ لفظ ترک کرے
مجاز کے لئے جو بات ہے فقط شایاں
غزل میں صرف کرے حکمت الٰہی کو
سلیس لفظوں میں لے آئے فلسفی مضموں
کہاں مسائل حقانیت کہاں وہ روش
یہ مانتا ہوں کہ اگلوں نے یوں کہا ہے مگر
بیان اصل حقیقت کرے مگر کیوں کر
علاوہ اس کے قصیدوں میں کیا ضرورت ہے
بخیل اصل میں وہ ہو مگر بحکم طمع
نہ اُس کے دل پہ اثر ہو نہ اپنے دل میں اثر
ازاں قبیل سمجھ لو بہت سی باتیں ہیں
اثر زیادہ ہو سامع پہ نثر کی نسبت
خلافِ فطرت و انسانیت ہو جو مضموں
کچھ اُن سے بحث نہیں جو نہیں ہیں اہل بحث
غرض مری ہے اُن ایسوں سے ہیں جو فہمیدہ
بہت سے اُن میں ہیں طرزِ قدیم کے عاشق
بہت سے وہ ہیں کہ جنکی غرض یہی ہے صرف
تو دست بستہ مری عرض ہے قصور معاف
میں برخلاف نہیں شاعری کے بلکہ اسے

جسے عبادتِ روحی سمجھتے ہیں عرفا
کہ اہل حال کے دل پر ضرور ہو انشا
پھرے نہ کوچۂ عرفاں میں آکے بے سروپا
کسی طرح سے حقیقت کو وہ نہیں ہے روا
نہ یہ کہ طائفہ داروں کا نظم ہو نخرا
کرے مسائل عرفاں محاوروں میں ادا
کہ جس کو پڑھ کے ہو پیدا خود اپنے دل میں حیا
تتبع اُن کا اسی میں کرے ضرورت کیا
کہ ہو مجاز کا ہلکا سا بیچ میں پردا
کہ ہر امیر کو کہدیں سکندر و دارا
بنائیں نظم میں ہم اس کو حاتم و کسرا
نتیجہ یہ کہ سنیں دیکھیں دیکھ کر عقلا
کہ جن کو پڑھتے ہی بیزار ہوگا ہر دانا
اسی لئے ہے فقط شعر و شاعری کی بنا
تو اُس میں قوتِ جذبِ قلوبِ خلق کجا
کلام ہوتے ہیں جن کے ہمیشہ بے سروپا
سمجھ کے چلتے ہیں وادیٔ نظم کا رستا
بہت سے ان میں ہیں طرزِ جدید کے شیدا
محاوروں میں فقط شوخیاں کریں پیدا
کہ اب زمانہ نے بدلا ہے اور پیرایا
کئی فنوں سے سمجھتا ہوں اشرف و اعلا

بشرط آنکہ نتیجے ہوں شعر کے معقول | نہ یہ کہ سلسلہ اس میں فقط ہو لفظوں کا
ہو استعاروں کی فرضی بناؤں کی بھرمار | ان استعاروں میں ایہام کا رہے پردا
کہ جس کو سن کے تعجب تو ہو اثر ہو خلاف | کہے یہ عقل کہ ان کاوشوں کا حاصل کیا
فراق و وصل و گل و بلبل و بہار و خزاں | جنون و عشق و جفا و وفا و ناز و ادا
کمال حسن و دل آویزی کرشمۂ حسن | جنون عاشق و جوش زمانہ سودا
ریا بھرے ہوئے پند و نصائح واعظ | شراب و ساقی مہرو و ساغر و صہبا
قصور و حور و جن و انس و آسمان و زمیں | بہشت و دوزخ و رندی و توبہ و تقوا
یہ سب اگر ہوں مناسب جگہ پہ مستعمل | اساتذہ نے کیا ان کو جس طرح املا
اساتذہ بھی وہ عارف جو اپنے وقت کے تھے | غرض کچھ اور نہ تھی جن کی معرفت کے سوا
تو شاعری نہیں اک قسم کی عبادت ہے | اسی کا نام ہے مرقات مقصد اعلا
جو اس طرح کے مضامیں ہیں صاف کھلتے ہیں | ہزار ڈھانکئے ان پر مجاز کا پردا
مگر جو اس کے مخالف ہے نیت شاعر | تو اس کے شعر سے ہوتا ہے خود بخود پیدا
کہ معرفت نہیں یہ ہے فقط ہوسناکی | کجا مسائل حقانیت یہ طرز کجا
وہ شعر کیا؟ کہ بزرگوں کے سامنے جو پڑھیں | تو اس کی شوخی مضموں سے خود ہو دل میں حیا
کہیں ابھار جوانی کا شعر میں ہو نظم | کہیں ڈوپٹے کا آنچل کسی جگہ انگیا
مرے زمانہ میں اخلاق سوز کیوں ہے یہ فن | نفاق و کبر میں بدنام کیوں ہوئے شعرا
ہر اک زبان پہ ہے بانگ انا و لاغیری | کسی کا کوئی معرف نہیں ہے اپنے سوا
غضب یہ ہے کہ ریاضت کے بعد بھی اکثر | ہے سب میں عیب کم و بیش خود پسندی کا
ہے شاعروں کو گویّوں کی طرح طعن سے کام | اگر کریں گے ثنا بھی تو اس میں ہو گی ریا
سبب یہ ہے کہ ہوا جہل آ کے عالم گیر | کیا دلوں کو تعصب نے مبتلائے بلا
صفائی قلب سے کوسوں الگ ہوا یہ فن | ہر ایک ہو گیا کبر و نفاق کا پتلا

جو دیکھیے تو مخالف ہے باپ سے بیٹا		بس انتہا ہے یہ اس کی کہ غیر تو ہیں غیر
کسی طرح نہ رہے شاعروں میں کبر و ریا		خدا کرے کہ مری قوم سے ہو دفع یہ بات
کسی پہ چیں بہ جبیں ہے مطلب نہیں ہمیں بخدا		یہ اپنی رائے سے ظاہر کیا جسے ورنہ

یہ بھی خیال ہے چالیس سال سے دل میں
اگرچہ من بہ کجا و شعور شعر کجا

سخن فہمی اور معنی فہمی

ادب کی ایک ایسے آراستہ اور مکمل باغ سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے جس میں ہر قسم کے درخت موجود ہوں۔ درختوں میں کئی قسم کے درخت ہوتے ہیں ایک وہ جو گھانس کی طرح اگتے ہیں دوسرے وہ جن میں پھول ہی پھول ہوتے ہیں پھل نہیں ہوتے تیسرے وہ جو پھل دیتے ہیں پھول نہیں دیتے۔ چوتھے وہ جن میں پھول بھی ہوتے ہیں اور پھل بھی لگتے ہیں۔ پانچویں وہ جو پھل اور پھول دونوں سے خالی ہیں۔ پھر اُن کے پھلوں اور پھولوں کی تاثیر اور اُن کی ذات وصفات کے خواص دیکھے جاتے ہیں۔ بعض درختوں کے پھول رنگین ہیں یا مگر خوشبو ندارد۔ بعض میں خوشبو ہے مگر رنگینی نہیں۔ بعض رنگ اور خوشبو دونوں رکھتے ہیں۔ بعض درختوں کے جسموں سے خوشبو آتی ہے۔ بعض کریہ الرائحہ ہیں۔ بعض نفع رساں ہیں۔ بعض مضرت بخش۔ بعض کے افعال وخواص معمولی ہیں۔ بعض کے حالات کو سوائے حکیم اور طبیب یا ماہر علم نباتات کے ہر شخص نہیں جان سکتا اور اُن کے خواص بطور اسرار کے ان میں موجود ہیں وہی حال ادب کا ہے اور شاعری اس باغ کی بہار ہے اور جیسے پھل پھول کا دیکھنا ایک بات اور اُنکے لطائف کا احساس دوسری بات ہے ویسے ہی شاعری کے لفظوں کو دیکھنا ایک بات اور اُنکے معنوی لطائف کا احساس دوسری بات ہے۔ یہ بہت ہی نازک خیال ہے جس کو بیان کر رہا ہوں ۵

دامن میں ہیں وہ گل جو کسی نے چنے نہیں		بلبل نے بھی یہ نغمۂ رنگیں سنے نہیں

ایشیائی شاعری کے باکمال اساتذہ نے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ سخن گوئی سے سخن فہمی اور سخن فہمی سے معنی فہمی زیادہ مشکل اور بہت زیادہ مشکل ہے لیکن یہ ایسا فیصلہ ہے جس سے اس اجمال کی تفصیل نہیں ہوتی۔ اور سخن گوئی اور سخن فہمی اور معنی فہمی کے مقاصد علیحدہ علیحدہ نظر نہیں آتے۔ اس کی مثال ایک پھول اور اُس پھول کے ظاہری رنگ اور خوشبو اور اُس رنگ اور خوشبو کے احساس لطائف سے ہے۔ یا ایک پھل اور اُس پھل کی ظاہری صورت اور اندرونی مٹھاس یا ذائقہ کے دوسرے مذاق پر مرتب کی جا سکتی ہے میں نے اردو کی کسی کتاب اور فارسی کے کسی رسالہ میں اس مونشگافی کی توضیح و تشریح نہیں دیکھی لیکن عربی کا انداز بیان اور بھاشا کا طرز خرام اس مقصد پر ایک حد تک کامیاب ہونیکا راستہ بتاتا ہے۔ اردو مذاق سے بھاشا کا مذاق بہت قریب ہے اسلئے مجکو اس مقام کی دلربائی کے لئے اصنام ہندی کا احسان اُٹھائے بغیر چارہ نہیں ؎

بت کریں آرزو خدائی کی	شان ہے تیری کبریائی کی

شاعری کو اپنے دیکھنے والے کی ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ اور جیسے حسن اپنی دلبری اور دلداری کے نیرنجات دکھانے سے خوش ہوتا ہے ویسے ہی شاعری تہ درتہ پردوں کے اندر اپنے ادائے حسن کی جلوہ ریزیوں کا تماشہ دکھانا چاہتی ہے اور جب وہ داد پالیتی ہے تو بے انتہا خوش ہوتی ہے اور ناآشنا کے پاس جانے سے زیادہ اُس کو کوئی تکلیف نہیں۔ چنانچہ میرزا صائب کو بےموقع داد ملنے اور مناسب موقع داد نہ ملنے دونوں حالتوں میں ایسی تکلیف ہوتی تھی کہ اُن سے اظہار شکایت کئے بغیر نہ رہا گیا وہ کہتے ہیں۔ ؎

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را	تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

شاعری چند سانچوں کے ذریعہ سے اپنا سر نکالتی ہے۔ ایک سانچہ وزن کا ہے کہ اُس میں جو موزوں الفاظ بھر دو وہ شعر بنتا چلا جائیگا۔ دوسرے لفظوں کا سانچہ جس میں موزونیت کلام سے طرح طرح کے معنی بھرے جاتے ہیں۔ تیسرے معنی کا سانچہ جس میں موزونیت لفظی سے طرح طرح کے الفاظ سانچے میں ڈھالے جاتے ہیں چوتھے وہ جو الفاظ و معانی دونوں کو موزوں

طبعی سے ڈہالتے ہیں گویا مشین کا کام دیتا ہے۔ لفظوں کے متعلق معنوی کیفیات اور لطائف کے سمجھنے کو ہر زبان میں کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ مغربی مذاق بھی ناٹک۔ تھیٹر، ڈراما میں ایک ایک لفظ کی صورت دکھانے اور اُس کے معنی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ پارسی قدیم میں یہ کام ایران کے مختلف معابد اور ہیکلکدوں میں مذہبی ڈراما کے خیالات کے ساتھ بڑی دلچسپی سے ظاہر کیا جاتا تھا۔ اور سنسکرت اور بھاشا میں بھی مذہب اور موسیقی کے ساتھ اس کو شریک کر دیا گیا ہے تاکہ اُس سے عام دلچسپی کو ترقی رہے۔ اس کو بھاشا میں ارت و نرت کہتے ہیں۔ اور اُس کا مقصد لفظوں کے معنی سمجھانا اور آنکھ کے اشارات اور جسم و اعضا کے حرکات اور اُن کی مختلف اداؤں سے طرح طرح کی قریب الفہم صورتوں کی پیدا اور معنوی حقائق کی ظاہر کرنا ہے۔ لیکن جیسے پیشتر موسیقی کا علوم حکمت میں شمار ہوتا تھا۔ یہانتک کہ بوعلی سینا جیسا شخص موسیقی نہ جاننے سے حکیم کے درجہ میں شمار نہ کیا گیا۔ اور صرف شیخ الرئیس کے خطاب سے مخاطب ہوا۔ مگر اب موسیقی بے انتہا ذلیل ڈوم ڈہاڑیوں کے مانگ کھانے کا ذریعہ بن رہا ہے۔ اور اب ایشیائی دنیا میں موسیقی سے حکمت کے خاص معانی و مبانی کو لگاؤ نہیں ویسے ہی ارتھ و نرت جو پہلے ہندوستان میں راجاؤں کی دربار اعلیٰ فیملیوں کے ترتیب مذاق کا ایک نہایت موثر عملیات میں تھے اور اُس سے ہر درجہ اور مقام کے داب و آداب اور اس درجہ و مقام کے لفظوں کے معنوی دقائق اور حقائق سمجھے اور سمجھائے جاتے تھے وہ بھی چند بازاری کسبیوں اور کتھکوں کے گھروں میں باقی رہ گئے ہیں جس سے وہ دیکھنے والوں کے دلوں کو لبھاتے اور رِجھاتے ہیں اور اُن کا نقشہ اتنا بگڑ گیا ہے کہ اُن کو اصل سے کچھ مناسبت نہیں لیکن اس پر بھی اُن کے بگڑے ہوئے نشانات ایک عجیب علم اور لاثانی بناوٹ کا پتا دیتے ہیں۔ اور اُن سے ایک مسمریزم کا سا اثر پیدا ہوتا ہے ؎

یہ جس کی پیری ہے اُس کا شباب کیا ہوگا

اُردو کا شاعر شعر کہتا ہے تو اپنے دل میں ایک یا دو معنی خیال کرتا یا قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ ارت اور نرت کرنے والے کسی جواب براے نام ہندوستان میں باقی ہیں۔ ایک ایک لفظ سے

اسکے متعدد معنی اور لطائف معنوی کا مینہ برسا دیتے ہیں جس سے لطائف معنوی کی ایک وسیع دنیا علیحدہ آباد نظر آتی ہے۔ جو بغیر اس تفنن کے نظر نہیں آسکتی۔ مثلاً ایک شخص نے گایا۔ آئی بہار اس کے معنی کیا ہیں۔ بہار آمد اور شاعر کے دل میں معمولی اور عام طور سے بہار کا مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔ یہی کہ پھولوں پر ایک طرح کا حسن مزید پیدا ہو گیا۔ مگر اس نے ارتھ اور نرت کے ذریعے بہار آئی کے ان گنتی نمونے سامنے حاضر کر دیئے جس سے ایک شاعر اپنے مذاق کی اصلاح کر سکتا ہے اور ایک حکیم اُن کے اسباب و علل کے جولانگاہ میں ہکا بکا ہو جا سکتا ہے اُس کا مختصر حربا یہ ہے۔

(۱) بہار آئی جوانی کی اور اُس میں جو جو بناؤ اور اٹھکھیلیاں ہوتیں اور جو امنگیں ظاہر ہوتی ہیں۔

(۲) بہار آئی حسن کی۔ اور اُس کی نوعیت الٰہی تیری پناہ۔

(۳) بہار آئی بارش کی۔ جاڑے کی۔ گرمی کی۔

(۴) بہار آئی موسم بہار کی۔

(۵) بہار آئی پھولوں کی۔

(۶) بہار آئی فصلی چیزوں کی۔ گٹھلی بوئی۔ کلّہ پھوٹا۔ درخت بڑھا۔ مور آیا۔ آم لگے۔ پانی برسا۔ آم ٹپکے۔

(۷) بہار آئی ساون کی۔ مع لوازم وغیرہ وغیرہ۔

یا کسی شعر میں وصل وصال فراق اشارہ۔ آمد یار۔ رخصت جاناں کا ذکر آیا تو ایک ایک لفظ کی مفہومات معنوی کی توضیح دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے اور جو خاص بھاشا کے مذاق سے متعلق ہے۔ اس کی بھاتایت اور بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اور وہ ہماری شاعری کی سرسری افہام سے دور اور بہت دور سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی نور اللہ مرقدہ نے علاوہ اپنی مسلم الثبوت اور بے مثل شاعری کے ایک اُردو لغات جمع کی۔ اُس کی پہلی جلد میں آنکھ کے متعلقات کا ذکر کیا ہے۔ جیسے آنکھ آنا۔ آنکھ اُٹھنا۔ آنکھ بیٹھنا۔ آنکھ دکھانا۔ آنکھ نکالنا۔ آنکھ پھڑکنا وغیرہ۔ یہاں آپ آنکھ پھڑکنے کے لفظوں کو دیکھیں کہ یہ کس زبان سے اُردو میں آئے ہیں تو آپ بہت جلد سمجھ جائیں گے کہ یہ ان کے معانی اور مبانی کا سراغ بھاشا

تک پہنچتا ہے۔ لیکن جب ہم ایک محققانہ غور سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ آنکھ پھڑکنے کی سب نوعیتوں کو دریافت کرنیکے لئے کسی کی چشم گویا سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ اور یہ سبق جب ہی مل سکے گا جب آپ کسی ارت اورٹرت کرنے والے سے یہ ٹھمری سنیں ؎

موری انکھیاں پھڑکن لاگیں

کیونکہ بھاشا کے مذاق میں آنکھ کا پھڑکنا کئی معنی رکھتا ہے اور ہر معنی کو مختلف لطائف کے ساتھ وابستگی ہے۔ دہنی آنکھ پھڑکنے کے معنی کچھ ہیں۔ بائیں آنکھ پھڑکنے کے معنی کچھ۔ ایک آنکھ چھ جگہہ سے پھڑکتی ہے۔ پس دونوں آنکھیں بارہ جگہہ سے پھڑک سکتی ہیں اور ہر مقام کے پھڑکنے کی ایک خاص تعبیر ہے کہ فلاں جگہ سے آنکھ پھڑکی تو اُس کا یہ اثر یا یہ مقصد سمجھنا چاہیئے پھر عاشق اور معشوق اور عورت و مرد کے آنکھوں کی پھڑکن جدا جدا مذاق ظاہر کرتی ہے اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مقام کیسا دلچسپ اور معنی خیز ہے اور اُسکے ساتھ اُس کی معلومات کے ذرائع کتنے کمیاب ہیں۔

اقسام سخن

سرسری طور پر واقف ہونیکے لئے اس بات کا جاننا ضرور ہے کہ شاعری میں اقسام سخن کے لئے کیا کیا نام مقرر ہیں یا کس کلام کو اصطلاحی طور سے کیا کہا جاتا ہے۔ اس لئے میں مختصر طور سے اُن کا ذکر کرتا ہوں اور ایک شاعر اقسام سخن پر قادر ہوئے بغیر اُستاد اور مستند نہیں مانا جاسکتا اور نہ ماننا چاہیئے۔ اب اقسام سخن ملاحظہ ہوں۔

مصرع

مصرع ایک شعر کے دو مساوی حصوں میں سے آدھے حصہ کا نام ہے خواہ دونوں حصے ردیف وقافیہ برابر رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن دونوں کے وزن کا برابر ہونا ضرور ہے مثلاً استاد ذوق کا شعر ہے

نگاہ پھیر کے عذر وصال[1] کرتے ہیں
مجھے وہ اُلٹی چھری سے حلال[1] کرتے ہیں[2]

[1] قافیہ [2] ردیف

اس کا ہر حصہ ایک مصرع ہے - اور بغیر ردیف و قافیہ کی مثال یہ ہے ۔ میر

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — مصرع

اُسی خانہ خراب کی سی ہے — مصرع

مطلع

مطلع اُس کو کہتے ہیں جو تصنیف میں سب سے پہلا شعر ہوتا ہے - اور مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیہ یا ردیف اور قافیہ دونوں کا التزام کیا جاتا ہے - پھر اگر مثنوی کا مطلع ہے تو آیندہ شعروں میں اختیار رہتا ہے کہ جس شعر میں چاہیں دوسرے قافیہ اور ردیف کے الفاظ لائیں اور ہر شعر میں ردیف و قافیہ بدلتے جائیں یا صرف قافیہ اختیار کریں - لیکن غزل قصیدہ قطعہ میں اُسی قافیہ کا ہم قافیہ لفظ لانا اور اگر قافیہ کے ساتھ ردیف ہو تو ردیف کا قایم رکھنا ضرور ہے مثال

مثال مطلع و اشعار مثنوی

مطلع	ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری (قافیہ بلا ردیف)	ثمرہ ہے قلم کا حمد باری (قافیہ بلا ردیف)	
	کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر (ردیف)	حمد حق و مدحت پیمبر	
	پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے (قافیہ)	یعنی کہ مطیع پنجتن ہے (قافیہ، ردیف)	

اس مثنوی کے پہلے اور دوسرے شعر میں قافیہ بلا ردیف ہے اور تیسرے شعر میں ردیف بھی لائی گئی ہے - اسی طرح اختیار ہے کہ جس شعر میں چاہیں صرف قافیہ کا التزام کریں اور جس شعر میں چاہیں قافیہ کے ساتھ ردیف کو بھی لائیں -

مثال مطلع و اشعار

غزل

مطلع	فدائے حسن یوسف کارواں ہے (قافیہ، ردیف)	جدھر تم ہو اُدھر سارا جہاں ہے (قافیہ، ردیف)	

کسی پر عمر بھر مرتے رہے ہم		نہ سمجھے کون ہے کیا ہے کہاں ہے (قافیہ، ردیف)
پڑے جھگڑے میں دل کا درد کھو کر		وہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھیں کہاں ہے (قافیہ، ردیف)
میں اب سمجھا کہ ہے کیا شے قیامت		ترا قصہ ہے میری داستاں ہے (قافیہ، ردیف)
ہجومِ آرزو نے ساتھ چھوڑا		یہ دل اب یوسفِ بے کارواں ہے (قافیہ، ردیف)

اس غزل کے مطلع میں قافیہ اور ردیف دونوں ہیں اس لئے سب شعروں میں قافیہ اور ردیف کا التزام ضرور رہا۔ اسی پر قطعہ اور قصیدہ کا خیال کر لیا جائے۔ اور اگر مطلع میں صرف قافیہ ہو اور ردیف نہ ہو تو صرف قافیہ کی رعایت کی جائے گی۔ جیسے استاد ذوق کا قصیدہ ہے۔

مطلع	شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خواب راحت		نشۂ علم میں مدہوش غرور نخوت (صرف قافیہ)
شعر	مر رہے لیٹا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے		تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت (صرف قافیہ)

قافیہ اور ردیف

قافیہ متناسب با ترتیب اور موزوں لفظوں کو اشعار میں ایک کے پیچھے ایک (قفا بقفا) لانے سے مراد ہے جو شاعر کو ادائے مطلب میں بہت بڑی مدد دیتا ہے اور شعر کو محدود اور معنی کو منضبط کرتا ہے اور شاعر قافیوں کے کٹکنوں پر چلتا اور اس داغ بیل سے شاعری کے راستہ کا ایک خاص پتا پاتا ہے۔ عربی فارسی اردو بھاشا کے قوافی میں بہت بڑا بیّن فرق ہے۔ عربی کے اکثر قوافی فارسی اور اردو میں صحیح نہیں مانے جاتے۔ ایسا ہی بھاشا کے اکثر قافیوں کو اردو کی شاعری تسلیم نہیں کرتی قوافی کی نسبت اساتذۂ کلام میں خاص خاص بحثیں ہو چکی ہیں۔ میرزا دبیر لکھنوی نے عربی کے مشہور ادیب مفتی میر عباس صاحب کے ایک قافیہ اُردو پر تامل کیا تھا یعنی مفتی صاحب نے میرا کا قافیہ طہ لکھا تھا۔ آخر کو مفتی صاحب نے مان لیا ہے کہ میرے خیال پر عربی کا ادب متصرف ہو اس لئے مجکو اردو میں اُردو کے مسلّمات کا خیال نہ رہا اسی طرح شیخ امام بخش صہبائی نے بعض قوافی پر جرح کی ہے اور مولانا فضل حق خیر آبادی اور منشی اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی سے اچھا خاصہ مناظرہ ہو پڑا تھا اور خود اُردو میں بھی قوافی کے صحیح و غلط۔ جائز و ناجائز۔ مستحسن اور غیر مستحسن ہونے کو

علم عروض و بیان کی کتابوں میں بیان کر دیا ہے۔ میں یہاں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اور نہ میرا مقصد آپ کو اس غلطیان میں ڈالنے کا ہے۔ بلکہ میرا مقصد صرف قوافی کو معمولی طور سے سمجھوا دینے کا ہے اس کے لئے چند قوافی لکھے جاتے ہیں۔

مثلاً۔ دام۔ کام۔ نام جام۔ یا عیاں۔ بیاں۔ جواں۔ تواں۔ وغیرہ

اردو میں قافیہ کے لئے ایطا عیب ہے۔ جیسے آنا۔ جانا کے قوافی میں سیانا۔ ایسے ہی دوسرے معائب جو معناً صحیح ہوں لیکن بولنے میں اچھے نہیں معلوم ہوتے جیسے خور اور نور کا قافیہ کو جس کا واؤ فارسی میں معروف پڑھا جاتا ہے لیکن اردو میں خوشگوار نہیں۔ اور ردیف قافیے کے بعد آتی ہے۔ اور وہ سب شعروں میں یکساں اپنی جگہ قایم رہتی ہے جیسے آنا ہوا جانا ہوا۔ اس میں آنا کا قافیہ جانا ہے اور ہوا ردیف۔ اس کی مثالیں اوپر بیان ہو چکی ہیں۔

شعر لغت میں بال کو کہتے ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا اور اصطلاح ادب میں شعر دو مصراع موزوں اور ہموزن کا نام ہے۔ اور جیسے معشوق کی مانگ بالوں کے دو حصوں کو بحصہ مساوی جدا کرتی ہے ویسی ہی شاعری شعر کے دو حصوں کو دو مصرعوں کے نام سے علیحدہ کرتی ہے۔ شعر کو بیت بھی کہتے ہیں۔ اچھا شعر نہایت آراستہ زلف جاناں کے مانند ہے اور مطلع مفہوم شعر میں داخل ہے۔ اچھے شعر کی مثال ؎

دل رہ گیا گیسوؤں میں پھنس کے
کھل گیا پھول رات بس کے   قلق

دیگر

اشاروں میں مطلب ادا ہو رہا ہے		نگاہوں میں وعدہ وفا ہو رہا ہے
	دیگر	لا اعلم
مزے کرلیں کلیم اب بن پڑی ہے		بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے
		ریاض

دیگر

تمہاری بزم کچھ ایسی ہی تھی نشاط افزا
تری گلی میں رہی باز گشت مثل نفس
رقیب نے بھی اگر پی مجھے سرور آیا
میں جتنی دور گیا واپس اتنی دور آیا
[illegible]

دیگر

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
غالب
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں میں

دیگر

حرم و دیر میں ہے جلوۂ پرفن اُس کا
دو گھر و نکا ہے چراغ اک رخ روشن اُس کا
[illegible]

دیگر

ہجوم شوق میں جب دل کی آرزو نکلے
جو پردہ کعبہ کا لوٹوں وہاں بھی تو نکلے

تمہیں تو ناز تھے نواب پارسائی پر ہُو
تمہارے گھر میں تو سے کی کئی سبو نکلے
[illegible]

رباعی

رباعی چار مصرعوں کی نظم ہے۔ رباعی کے اوزان بہت ہیں۔ اور بعض حالتوں میں چاروں مصرعوں کے اوزان میں جائز تفاوت ہوتا ہے مگر وہ موزوں تفاوت کسی مصرع کو پڑھنے میں سامع کے ادراک کو اپنی سبکی اور گرانی سے ناخوش نہیں کرتا۔ رباعی میں بڑے بڑے مطالب چار مصرعوں میں سما جاتے ہیں۔ رباعی ایک ایسا سانچہ ہے جو اعلیٰ درجہ کے معنی خیز مقاصد کو اپنے آپ میں اپنی خاص ترکیب و ترتیب سے جگہ دیتا اور تھوڑے لفظوں میں بہت مطلب کے ادا ہونیکی گنجائش رکھتا ہے پہلے عربی اور فارسی میں رباعیات کا بہت بڑا چرچا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے مطالب کو رباعیات کے ذریعہ سے ادا کیا جاتا تھا تاکہ وہ مطالب آسانی سے یاد رہ سکیں اور فاضل مصنف کا قابل قدر یادگار رہیں۔ از انجملہ عمر خیام کی رباعیاں ایسی مشہور و مقبول ہوئیں جنکا شہرہ نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی پایا جاتا ہے۔ لندن میں ایک خاص کلب عمر خیام کلب کے

نام سے مقرر ہے۔ اور انگریزی میں تین شرحیں لکھی گئی ہیں جس پر مسلمان خصوصیت سے اظہار شکر گذاری کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ مذاق کی مغایرت نے انگلش قدر دانوں کو شاعری کے اصلی دقائق اور فلسفہ کے حقیقی حقائق کے سمجھنے کا بہت تھوڑا موقعہ دیا ہے۔ کاش نئے تعلیم یافتہ اہل کمال میں کوئی گریجویٹ اُن رباعیات کی صحیح شرح کرکے انگلش سوسائٹی کو تحفہ بھیجے تو اپنا ایک خاص فرض ادا کرنے والا ہوگا۔ راقم نے فارسی کی سیکڑوں رباعیات کو ایک جگہ جمع کیا ہے جس کو شاعری کی کان معنی کہہ سکتے ہیں۔ اُردو میں رباعیات کو عام شاعری میں جگہ نہیں ملی اور بہت اچھا ہوا جو شاعری کا یہ حصہ عمومیت سے بچا رہا۔ اور رباعی کی ترکیب و ترتیب اور اُس کا مذاق بھی افہام عوام سے دور ہے۔ اس لئے اکثر اعلیٰ درجہ کے ارباب کمال اور ادبائے کلام نے رباعیات کو اظہار کمال کا ذریعہ بنایا۔ جیسے میر انیس۔ میرزا دبیر۔ یا خاص خاص شعرا، رباعی کا چوتھا مصرع من حیث لطافت و بلاغت مضمون نہایت بلند ہوتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ مثال چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں ؎

رباعی

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
نزدیک رگِ جاں سے ہو اُس پہ یہ بُعد
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

رباعی

یہ عشرت و عیش و کامرانی کب تک
گر یہ بھی سہی بقائے دولت ہے محال
عشرت بھی ہوئی تو نوجوانی کب تک
دولت بھی ہوئی تو زندگانی کب تک

رباعی

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

رباعی

گلشن میں پھروں کہ سیر دریا دیکھوں
یا معدن و کوہ و شہر و صحرا دیکھوں
ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

رباعی

واحد سے میں جمع کا طلب گار ہوا
جو سرّ عظیم تھا وہ اسرار ہوا
اک نور تھا جب اُس میں ہوئی جمع صفت
بڑھتے بڑھتے وہ نور انوار ہوا

رباعی

اللہ کا فضل ہے جو لکھواتا ہے
لا شئے کو وہ شئے سے بڑھ کے دکھلاتا ہے
گو نقطہ ہوں اشہری مگر وقتِ رقم
جس ہندسہ سے ملوں وہ بڑھ جاتا ہے

رباعی

نیچر نے دیئے ہیں ہمکو جو پانچ حواس
کرتے ہیں کم و بیش انہیں سے احساس
لیکن جو نہ محسوس ہو ان سے ہمکو
کیونکر اُسے محسوس کرے عقل و قیاس

مثلث

عربی میں ثلث تین (۳) کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاحِ سخن میں مثلث برابر کے تین مصرعوں سے مراد ہے اور کسی شعر یا پوری غزل اور قصیدہ کا مثلث بنانا شعر سے پہلے ایک نئے مصرع کا اضافہ کرنا ہے جو مناسبت مقام اور اپنی موزونیت کلام سے اُس شعر کے ساتھ مطابقت کلی رکھتا ہو اور شعر کی معنوی خوبیوں میں ایک لطیف ترقی اور حسن مزید کا اضافہ کرتا ہو جیسے میر انیسؔ کا شعر ہے ؎

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

ہم نے اس پر مصرع لگایا تو یوں مثلث بن گیا

ہوگئی میری شہادت جانفزا میرے لئے
خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

مخمس

عربی میں خمس پانچ کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاح سخن میں مخمس برابر کے پانچ مصرعوں سے مراد ہے۔ اور کسی شعر یا پوری غزل اور قصیدہ کو مخمس بنانا ہر شعر سے پہلے تین نئے مصرعوں کا اضافہ کرنا ہے جو ہر اعتبار سے اُس شعر کے ساتھ مناسبت اور مطابقت رکھتے ہوں۔ اور سننے والے کو معلوم ہو کہ اصل شعر پر جو مصرعے لگائے گئے ہیں۔ اُن کی اُس شعر کو ضرورت تھی اور مصرعوں کے لگانے سے اُس شعر کی تفصیل اور معنوی خوبیوں میں ایک لطیف اضافہ ہوگیا ہے۔ گویا مثلث میں دو مصرعوں کا اور اضافہ ہوا ہے۔ مخمس کو خمسہ بھی کہتے ہیں۔

تضمین

مضمون کی توسیع و ترقی کے لئے جو اشعار ضمن کلام میں لائے جائیں اُس کو اصطلاح سخن میں تضمین کہتے ہیں مثلاً ایک شعر یا پوری غزل اور قصیدہ پر ہم نے مصرعے لگا کر خمسہ کیا تو کہا جائیگا کہ ہم نے اُس شعر یا غزل یا قصیدہ کی تضمین کی تضمین میں وہی اوصاف ہونا چاہئیں جو مثلث اور مخمس کے ذکر میں مذکور ہوئے۔

مسدس

مسدس چھ مصرع یا تین شعر سے مرکب ہے پہلے دو شعر یا چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اور اگر ردیف ہے تو وہ بھی لازم ہوتی ہے۔ پھر تیسرا شعر یا دو مصرعے اپنا قافیہ و ردیف علیحدہ رکھتے ہیں۔ اُردو میں سب سے زیادہ شاعری نے مسدس کی شکل میں اظہار کمال کیا ہے میرانیس اور میرزا دبیر اور دوسرے مرثیہ گویان لکھنؤ کے نہایت قابل قدر کمال کا ذخیرہ مسدس کی شان میں ہے۔ اور نئی روشنی کے مجتہد الشعرا مولانا الطاف حسین حالی کی سب سے زیادہ مشہور و مقبول تصنیف بھی مسدس کی صورت میں ہے۔ اور اکثر شعرا اردو نے اپنے اپنے واسوخت بھی مسدس کی شکل میں لکھے ہیں۔ اور مسدس ہے بھی ایسی چیز کہ اُس میں نہ تو شاعر کو تلاش قوافی کی زیادہ دقت ہوتی ہے اور نہ ایک مطلب کے ادا کرنے کو تین شعر کا ایک بند ناکافی ہوتا ہے۔ اور مسدس کے پڑھنے

ہیں ادائے بیان کو مناسب سکون و توقف کے حدود ملتے جاتے ہیں جو پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کے لئے خوش آیند ہیں۔ راقم نے ترانۂ معرفت نام ایک مسدس لکھا اُسکے دو بند بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں۔

کلیدِ گنجِ حکمت رازِ عرفانِ الٰہی ہے ہر اک ذرہ کو اُس کے رتبۂ خورشید چاہی ہے	گدا کو اُس کے کوچے کی نوید بادشاہی ہے جہاں میں اُسکو شایاں منصبِ عالم پناہی ہے

رہے منشورِ شاہی قل ہو اللہ احد اُس کا
چلے توحید کا سکہ ازل سے تا ابد اُس کا

زمانے سے سُنا میں نے زمیں تیری زماں تیرا سمک سے تا سما اے صانعِ کون و مکاں تیرا	فلک تیرے ملک تیرے بشر تیرے جہاں تیرا سر پہ عرش تیرا فرش تیرا لامکاں تیرا

ابد سے تا ازل تو ہے ازل سے تا ابد تو ہے
خدایا سارے عالم میں احد تو ہی صمد تو ہے

قطعہ

ایک بڑا مضمون جو ٹکڑے ٹکڑے (قطعہ قطعہ) کر کے مسلسل ترتیب سے اشعار میں لایا جائے تو اُن اشعار کو قطعہ کہیں گے قطعہ میں مطلع ہونا لازم نہیں اور نہ اُسکا ہونا ممنوع ہے۔ قطعہ دو شعر سے کم نہیں ہوتا اور زیادہ کیلئے کوئی حصر نہیں کیا گیا لیکن زیادہ اشعار کا لانا خوشگوار نہیں۔

قطعۂ گل و بلبل

میں علی گڑھ میں آج جا نکلا قبرِ سید پہ دیکھتا کیا ہوں جمع ہیں بلبلانِ نغمہ سرا حالی حالی کی آ رہی ہے صدا	تھے فلک سے برس رہے انوار ہے گلوں کا لگا ہوا انبار ہیں وہ کالج سے برسرِ پیکار شبلی شبلی کی پڑ رہی ہے پکار

دیکھکر مجھکو گل نے مجھ سے کہا ۔ اے سخندانِ ریختہ گفتار

گل و بلبل کا یہ مقدمہ ہے ۔ یہ نہیں جنگ زاغ و بوتیمار

ہے نباتات میں شرف مجھکو ۔ میں ہوں روحِ روانِ باغ و بہار

مے ہے کھنچتی رہی سدا میری ۔ وہ رہی غافل اور میں ہشیار

ہے عنادل کو مجھ سے دلچسپی ۔ مجھ پہ سو جاں سے شیفتہ ہے ہزار

میں عرب کا جلیس و ہمدم ہوں ۔ میں عجم کا ہوں مونس و غمخوار

آئے خوشبو مرے پسینہ سے ۔ میں چمن میں ہوں سیّد و سردار

پوچھ لیجے مجھے طبیبوں سے ۔ میں ہوں دربانِ عاشقِ بیمار

میں چمن میں جوانِ رعنا ہوں ۔ میں ہوں اک شاہزادۂ کہسار

میں صحیفہ ہوں رازِ نیچر کا ۔ مجھ میں پوشیدہ سیکڑوں اسرار

جب مدوّن ہوئے اصولِ ادب ۔ مجھکو دیکھا کہ میں ہوں حاملِ کار

میرے پردے میں سب ہیں چھپ سکتے ۔ ساری دنیا کے آتشیں رخسار

میرا پردہ ہے پردۂ رحمت ۔ میرا دامن ہے دامنِ ستّار

چپ ہوا گل تو ایک بلبل نے ۔ کی زبانِ ادب سے وا منقار

اور گویا ہوا وہ نغمہ سرا ۔ اے سخندان و محرمِ اسرار

مجھکو بخشا ہے خاص نیچر نے ۔ عشقِ گلہائے آتشیں رخسار

میرے نغموں سے گوش گل شنوا ۔ میرے نالے سخن فروشِ بہار

میں ہوں سرتاجِ عاشقانِ چمن ۔ میں ہوں جانبازِ وادیٔ پرخار

سارے عشاق میرے زلّہ ربا ۔ اُن میں مخصوص نیچرل کردار

میری تقلید فرضِ عین انھیں ۔ میری تفرید واجب الاقرار

گل و بلبل کے نام سے ہرگز ۔ فاش پردہ نہ ہو کبھی زنہار

میرے راز و نیاز کی باتیں
نقل عشاق کے لئے درکار

یہ ترانے یہ پچھے میرے
یہ مرے نالہ ہائے آتشبار

وصل گل پر یہ زمزمہ سنجی
ہجر گل میں یہ شکل زار و نزار

نیچرل شاعری کو لازم ہے
تا ہوں آساں مقاصد دشوار

غیر واقف نہ ہو کہ بات ہے کیا
گل و بلبل میں یوں چھپیں اسرار

اب جو منظور ہے علیگڑھ کو
لائے بے پردہ کرکے روئے نگار

دونوں ناموں سے عشق بازی ہو
کشش و جذب کے کھلیں اسرار

تو ہمارا ہے اس ادب کو سلام
جو ہے ترکِ ادب کا خاص شعار

قطعہ بند

اگر مطلب بڑا ہو یا ایک شعر کا مطلب اُسی شعر کے لفظوں میں پورا نہو اور اُسکو دوسرے شعر یا چند اشعار میں پورا کیا جائے تو دوسرا شعر یا اُن چند شعروں کو قطعہ بند کہیں گے اگرچہ وہ مثنوی کے شعر ہوں۔ چنانچہ پچھلا قطعہ قطعہ ہے اور قطعہ بند بھی۔ لیکن یہاں ایک دوسرا قطعہ قطعہ بند حالتوں کے دکھانے کو لکھا جاتا ہے۔ اشہری۔

قطعہ قطعہ بند

صبح کا تھا وقت چلتی تھی نسیم جانفزا	قطعہ بند	میں سوادِ شہر سے باہر ہوا کھانے گیا
جھومتے تھے ڈالیوں پر پھول کس انداز سے		جیسے جھولا جھولتے ہوں مہوشانِ دلربا
نور کا تڑکا سحر کا وقت کھلتی کونپلیں		تتلیاں اُڑ اُڑ کے دکھلاتیں عجب شانِ خدا
آرہی تھی بھینی بھینی بوئے خوش ہر سمت سے		چل رہی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہر طرف بادِ صبا
راستہ پر ایک شے مجکو پڑی آئی نظر	قطعہ بند	صبح کے ہمرنگ تھی وہ مایۂ شاہ و گدا
دودھ کی صورت سپید اور سخت پتھر کی طرح		شیر ماہی کی طرح اُجلی مجلّا باصفا

جسم تھا سارا مشبک سینکڑوں سوراخ تھے ہوتی تھیں پیدا صدائیں اُس میں جب بھرتی ہ
خوش فضا میداں میں آتی تھی نظر وہ اس طرح جوں حسیں دکھلائے کوئی خندۂ دنداں نم
نام کو تھا جسم پر اُس کے نہ پیراہن کوئی لیکہ سارا جسم تھا ایک نورِ مطلق سے ڈھک
دیکھکر محوِ تحیر مجکو اُس نے بات کی یوں زبانِ حال سے گویا ہوئی وہ عشوہ زا
ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام اندر جہاں مولوئی رُوم گاہے بود با من آشنا
قرنہا شد باغزالی چشم الفت داشتم عمرہا با سعدی و حافظ نشستم بر ملا
کیا کہوں میں رہنے والی کس محل کی تھی کبھی جو محل معمارِ قدرت نے بنایا تھا مرا
خاک کی چٹکی مری ناصور کو اچھا کرے پاتے ہیں کمزور جوہر سے مرے حکم شفا
مجکو پردوں میں چھپایا دستِ قدرت نے مگر رنگ و روغن پھوڑکر اجسام سے نکلا مرا
میرے جوہر سے نسب کو فخر تھا اقوام میں میرے گوہر سے ہوا کرتی تھی لفظوں میں جلا
مجھ سے پڑھتے ہیں جیالوجسٹ دنیا کی سبق دے قدامت کا پتہ میری زمینِ نینوا
عقل و ادراک صحیحہ کے لیے معیار ہوں ہوں فزیالوجی والوں کے لئے میں رہنم
بھٹی میں ہستا خوان یعنی خانۂ ہستی کبھی اب دیا ہے استخواں ترکیب لفظی نے بنا
اب زمانہ نے کیا ہے موردِ عبرت مجھے ہوں میں اک ہڈی پرانی کیا کہوں اسکے سوا

اب بھی مجھ میں اس قدر جوہر بھرے ہیں اشہری
روشنی بخش جہاں ہے میرے جوہر کی ضیا

مثنوی

مثنوی میں ہر چیز کی ثنا و صفت کی جاتی اور ہر طرح کے واقعات کو جگہ دی جاتی ہے۔ مثنوی ک ہر شعر میں نیا قافیہ اختیار کیا جاتا ہے یا ردیف و قافیہ دونوں نئے ہوتے ہیں جنکی رعایت صرف اُسی شعر کے دو مصرعوں میں کی جاتی ہے۔ فارسی میں شاہنامہ۔ سکندر نامہ۔ یوسف زلیخا۔ اور اُردو میں گلزار نسیم۔ اور میر حسن کی مثنوی اور طلسم الفت مثنوی کا نمونہ ہیں ۵ اشہری۔

مثال مثنوی

ہوں شاہِ جہاں سے ہیں سخن ساز
اُردو سے ہے مری نسیم شیراز

سوکھے ہوئے پھول اس چمن کے
گلدستے ہیں اہلِ انجمن کے

ہر دل ہے مرے کلام سے شاد
اقلیمِ سخن ہے مجھ سے آباد

خامہ علم و نشان ہے میرا
کاغذ کا ورق جہاں ہے میرا

ناظم ہیں کلام کے مقالے
ہیں فوج کی جا مرے رسالے

ہر دشت ہے شاہراہ میری
ہر شہر ہے تخت گاہ میری

دیہیم عجم ہے تاج میرا
ہے دادِ سخن خراج میرا

غزل

غزل کے معنی سخن با محبوب گفتن کے ہیں یعنی معشوق سے بات کرنا اسلئے ایک غزل میں جداگانہ معنی کے اشعار لانیکا اصول اختیار کیا گیا ہے۔ کسی شعر میں عاشق اپنے جذباتِ باطنی کا اظہار کرتا ہے جس سے معشوق متاثر ہو۔ کسی شعر میں معشوق کی تعریف کرتا ہے جس سے وہ خوش ہو کر اُس کی جانب متوجہ ہو۔ کہیں حبیب کی احسان مندی کا اعتراف ہوتا ہے اور کہیں رقیب کی شکایت کا اظہار بہرحال جو واقعات معشوق کی خلوت اور جلوت میں پیش آتے یا پیش آسکتے ہیں۔ یا جو بات عاشق کو کہنا اچھی معلوم ہوتی ہے اور جس پر معشوق کے خوش ہونے یا اور کسی خاص نتیجہ کے پیدا ہونیکی اُمید کی جاسکتی ہے وہ غزل کے اشعار میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اور کہیں شاعری کے ذریعے سے حسن بیان کا دکھانا مقصود ہوتا ہے اور کہیں فلسفہ و حکمت اور پند و موعظت کی مضمون بھی اشعار غزل میں لائے جاتے ہیں جنکو شاعر کسی مفید اثر پڑنیکے لئے قلمبند کرتا ہے۔

شاعری کا دور اول غزل کو خاص طور سے حسن و عشق کے راز و نیاز اور عاشق و معشوق کے ادائے مطالب میں صرف کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور نیز دور اول میں غزلیات کو موسیقی کی ذریعے سے

عاشق و معشوق کے خلوت و جلوت میں باریابی اور کاربرآری کا خاص ذریعہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ
خسرو پرویز اور شیریں کے حالات اور واقعات اور دونوں کی بزم آرائی اور باربد اور نکیسا کی
مطربانہ نغمہ سنجی اور غزلیات کے ذریعہ سے دونوں کے سوال و جواب اس بات کا پتہ دیتے
ہیں کہ دور اول میں غزل کو خاص طور سے اس کام میں لایا جاتا تھا۔

اردو کی دنیا میں صرف غزل کے چند ذرائع ہیں ایک مشاعرہ جس میں شعرا جمع ہو کر اپنی
غزل پڑھتے اور داد سخن سے دل خوش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ گلدستے جو مخصوص غزلیات کی
اشاعت کو شائع ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اس زمانہ کے گانیوالوں نے چند غزلیں یاد کرلیں اور ہر
مجلس میں ان کو گا کر امیر غریب عاشق معشوق سب کو رجھالیا۔ چوتھے سوال و جواب کا طریق
جو سب سے پہلے لکھنؤ میں امانت نے اندر سبھا میں ایجاد کیا۔ اور واجد علی شاہ کے رہس میں اس نے
جگہ پائی اور اب انگریزی ناٹک تھیٹر کی وضع میں جابجا وہی طریق دوسرے معمولی لباس میں
نظر آتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ شاعری میں غزلیات کا حصہ بازاری کسبیوں اور گویوں
کے سبب سے زندہ ہے اور عام غزل گوئی کو چند گلدستوں نے زبردستی چلا رکھا ہے۔ اردو کی غزل
گوئی پر فارسی مذاق کا پورا پورا اثر پڑا ہے۔ بھاشا میں عورت کا عشق مرد کی طرف منسوب کیا جاتا
ہے۔ عرب میں مرد کا عورت پر۔ فارسی میں مرد کا مرد پر۔ مگر فارسی میں عورت مرد دونو کیلئے ایک صیغہ بولا جاتا ہے
اور اردو میں عورت مرد کیلئے مذکر اور مونث کے دو صیغے ہیں اور اردو کا معشوق مذکر ہو اگرچہ عورت ہو سے

وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا — امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

غزل کی مثال

آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں	کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں
پاکے ان کو بڑھ گئی ہے اور بھی کچھ آرزو	کل تھے کیا کہنے کو ہم اور آج کیا کہنے کو ہیں
ہوشیاری پختہ کاری کوئی ان سے سیکھ جائے	ناسمجھ تو سمجھے وہ نام خدا کہنے کو ہیں
ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ	برہمن کیا ہم اسے پیش خدا کہنے کو ہیں

ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں علیل	جان دیتے ہیں جو چپر پارسا کہنے کو ہیں

غزل پانچ شعر سے کم اور اکیس ۲۱ شعر سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔ اور زیادہ کہنے والوں کیلئے کوئی قید نہیں۔

تشبیب

تشبیب کے معنی ہیں ذکر شباب کردن یعنی شباب کے ولولوں کا ذکر کرنا۔ اور وہ اقسام شباب سے متعلق ہے جیسے جوانی۔ بہار حسن وغیرہ۔ اگر شاعری میں صرف انکے شباب کا ذکر کیا جائے تو اسکو تشبیب کہیں گے۔ جیسے اکثر قصائد میں دیکھا ہوگا کہ پہلے کسی قسم کی تشبیب کا بیان کیا تاکہ سامعین کے قلوب میں تازگی اور شگفتگی کا اثر پیدا ہو اس کے بعد اس سے گریز کر کے مدح ممدوح کی جانب کلام کا رخ پھیرا۔ یا مرثیوں میں پہلے تشبیب بیان کی پھر بزم آرائی اور رزم آرائی پر متوجہ ہوئے جس بحر سامعین کے دلوں پر درجہ بدرجہ ہر قسم کے اثر پڑتے جائیں اور اگر صرف تشبیب لکھنا مقصود ہے تو تشبیب لکھکر کلام کو تمام کر دیا۔

قصیدہ

اقسام شاعری میں قصیدہ کا درجہ سب سے زیادہ بلند ہے۔ قصیدہ میں شاعر کے اوج خیال کا انتہائے کمال اور اس کی فکر کا منتہائے عروج دیکھا جاتا ہے اور جیسے غزل کہنے کیلئے عشق کے لوازم اور حسن کے مراتب سے واقف ہونا ضرور ہے۔ ویسے ہی قصیدہ کے لئے بادشاہی دربار اور آداب سلطنت سے واقف ہونا واجب ہے تاکہ وہ ہر لفظ اس درجہ کے مناسب لا سکے اور اسکی کوئی بات داب و آداب کے خلاف نہ ہونے پاوے۔ فارسی میں خاقانی اور قاآنی کے قصائد لاثانی ہیں۔ اور اردو میں سودا۔ ذوق۔ مومن۔ نسیم دہلوی۔ میرزا غالب۔ امیر مینائی۔ منیر شکوہ آبادی کے قصائد کا ایک جگہ جمع ہونا اور غور و معنی فہمی سے ان کا مطالعہ کرنا بڑے بڑے افادات کلام کا ذریعہ ہو سکتا ہے اور اس سے اردو کے مناسب حال اردو کے ادب اور شاعری کی ایک خاص رہنمائی ہو سکتی ہے

ترکیب بند

ایک قطعہ میں اپنا مطلب لکھنا۔ اور چند شعر ہم قافیہ و ردیف کے بعد ایک شعر اس سارے قطعہ

کے تمام مقاصد کو دوسرے قافیہ وردیف کا لانا۔ اور پھر دوسرا بند شروع کرنا اور اسی طرح چند شعر کے بعد ایک
شعر لانا۔ اس کو ترکیب بند کہتے ہیں۔

ترجیع بند

ایک قطعہ میں اپنا مطلب بیان کرنا اور پھر کسی خاص شعر کی جانب جسکے معنی اُس مقصد سے
ملتے ہوں رجوع کرنا اور اس التزام کو آخر نظم تک قایم رکھنا یہ ترجیع بند کی اجمالی تعریف ہے اور بند کے
بعد جو شعر لایا جائے وہ عرف عام میں خاص شہرت اور قبولیت رکھتا ہو تو زیادہ لطف کی بات ہے۔

مرثیہ

مرثیہ کے معنی مردہ کی تعریف کرنیکے ہیں اور پہلے اُردو میں کہا جاتا تھا کہ بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو لیکن میر انیس
اور میرزا دبیر اور لکھنؤ کے دوسرے باکمال مرثیہ گوؤں نے واقعہ کربلا کی رزم و بزم سے نہ صرف اس مشہور
مثل کو غلط ثابت کیا بلکہ اقسام شاعری کو مرثیہ اور سلام اور رباعیات میں دکھا گئے۔ اور مرثیہ گوئی کے فن کو
ایک ایسا علم بنا گئے جو اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی اُن کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ خلیق۔ ضمیر۔ انیس۔
دبیر۔ مونس۔ انس۔ نفیس۔ سلیس۔ وحید۔ عشق۔ فصیح۔ کے مرثیوں اور سلاموں اور رباعیوں کا جمع
ہو جانا اُردو کی شاعری کے لئے فصاحت و بلاغت کا معدن اور نہایت قابل قدر معلومات کا خاص
ذریعہ ہے۔ اور مرثیوں کی شاعری کو رواں پڑھنے سے موزون طبعی کا خاص نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ جو طبیعت کو آپ
ہی آپ موزوں کر لیتا ہے۔ جیسے شاہنامہ پڑھنے سے ایک روانی پیدا ہوتی ہے۔ مرثئے اکثر بلکہ سب کے
سب مسدس کے طور پر لکھے گئے ہیں گویا یہ وضع مرثیوں کیلئے مخصوص ہو گئی ہے اور مرثیوں سے
نیچرل شاعری اور رزم و بزم کی واقعہ نگاری کا لاثانی اقتباس کیا جا سکتا ہے۔

سلام

جیسے تہنیت کے جلسوں میں غزل کا کام ہے ویسے ہی ائمہ علیہم السلام کی مجلس عزا میں
سلام غزل کا قایم مقام ہے۔ مرثیہ گویان لکھنؤ نے شاعری کا جو کمال سلاموں میں دکھایا وہ
بہتوں سے غزلیات میں نہ دکھایا گیا۔ سلام میں مطلع اور اشعار اور مقطع مثل غزل کے لائے جاتے ہیں

اور جو مضمون زیادہ بیان کرنا ہوتا ہے تو اشعار کو قطعہ بند کیا جاتا ہے۔

واسوخت

واسوخت میں عاشق کی طرف سے جلی کٹی باتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ کبھی عاشق اپنے پچھلے زمانہ اور معشوق کی مہربانی کو یاد کرتا ہے اور کبھی اپنی موجودہ حالتوں اور معشوق کی نامہربانیوں کی شکایت کرتا ہے کبھی معشوق کے دل پر اثر کرنیوالے فقرے تراشتا ہے۔ کبھی رقیب کی شکایتوں کا ذکر کرتا ہے وغیرہ علیٰ ہٰذالقیاس

آج کل واسوخت کا چرچا کم ہے۔ اور اچھا ہے جو اس طرف سے بیخبری ہے پچھلی تصنیفات میں اکثر شعرا کے واسوخت دو جلدوں میں مطبع اودھ اخبار سے شائع ہو چکے ہیں۔ اور شعلہ جوالہ اُس مطبوعہ مجموعہ کا نام ہے انمیں واسوخت امانت۔ واسوخت سحر۔ واسوخت رعنا اپنے اپنے مذاق میں خاص قسم کے ہیں

شعرائے مشاہیر

میری عمر پچاس سال سے متجاوز ہے۔ میں ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنی عمر میں جن شعرا کو دیکھا یا سُنا اُن کی ہم بزمی کا اتفاق ہوا یا میں نے انکو اپنی عمر کے طبقہ اعلیٰ کے افراد میں پایا۔ اُن کے نام نامی واسمار گرامی سے اس کتاب کو عزت دیتا ہوں اُن میں سب سے اول اُردو کے فردوسی میر انیس کا نام لیتا ہوں۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا		کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے	

میر انیس غفر اللہ تعالیٰ

بلبل نے بھی یہ نغمۂ رنگیں سُنے نہیں		دامن میں ہیں وہ گل جو کسی نے چنے نہیں	

میر انیس فیض آباد کے رہنے والے ہیں خلیق کو میر صاحب کی اُستادی کا فخر حاصل ہے میر حسن دہلوی میر صاحب کے حقیقی دادا ہوتے ہیں جنکی مشہور مثنوی اردو مثنویات میں ابتک آپ ہی اپنا نظیر سمجھی جاتی ہے۔ مغربی مذاق بھی اُن کے ڈراما کی ترکیب اور اُنکی سادہ دپرکار شاعری کو پسند کرتا ہے اپنی دلفریب حالتوں سے اس مثنوی نے ناٹک تھیئٹر میں بھی جگہ پائی ہے۔ اور ہندوستانی مذاق میں تو اُس نے عام دلچسپی اور دلفریبی حاصل کی ہے۔ میر انیس عنفوان شباب میں فیض آباد سے لکھنؤ

تشریف لائے اُس زمانہ میں لکھنؤ بھی شباب پر تھا۔ اور شیعہ مذہب کی سلطنت اور حکمرانی نے محرم کے ولولوں میں بڑی ترقی ظاہر کر رکھی تھی۔ اسی لئے میر صاحب نے مرثیہ گوئی میں اظہار کمال شروع کیا اور ممبر پر بیٹھتے ہی قبولیت دست بستہ سامنے کھڑی ہوئی۔ اور خدا نے حسن کلام کے ساتھ حسن بیان کا حصہ بھی میر صاحب کے لئے علٰحدہ کر دیا لکھنؤ جیسے شہر میں میر صاحب کا فروغ پانا اُن کے لاثانی کمال کی مکمل شہادت ہے اور تمام ہندوستان میں کوئی نہیں جو میر صاحب کے لاثانی کمال کا معترف اور معتقد نہ ہو۔ فردوسی نے شاہنامہ میں مختلف لڑائیوں کا حال لکھا ہے جو شاہانہ سامان جنگ سے برپا ہوئیں اور میر صاحب نے کربلا کی ایک مختصر اور محدود جنگ میں معجز بیانی کا وہ کمال دکھایا ہے جس کو فردوسی بھی حیرت زدہ ہو کر دیکھ سکتا ہے۔ اور میر صاحب کی تصنیف کا شمار دو لاکھ شعر سے زیادہ بیان کیا جاتا ہے جو فردوسی کی مقدارِ تصنیف سے کہیں زیادہ ہے۔ اُردو کو اس امر کی خاص ضرورت ہے کہ میر صاحب کی سوانحعمری بڑی ژرف نگاہی سے لکھی جائے اور عربی اور فارسی کے ابتدا کلم سے رزم و بزم کا مواد جمع کیا جائے اور ایک ایک تصنیف کے مقابلہ میں میر صاحب کی تصنیف کو دکھایا جائے۔ مولانا شبلی صاحب نعمانی نے آنریبل خلیفہ محمد حسن خاں صاحب مرحوم وزیر پٹیالہ کی اعانت سے اس قسم کا مواد جمع کیا تھا۔ اور مجھ سے فرماتے تھے کہ اگر میں میر صاحب کی سوانحعمری لکھنے کو تیار ہوں تو وہ مواد مجھکو عنایت کر دیں گے۔ لیکن میں خود کو اس قابل نہیں پاتا اور اگر اپنی عزت سمجھکر اس کام پر آمادہ ہوں تو برس دو برس اس کام میں مصروف رہنے کا اطمینان نہیں۔ اور بغیر ایک خاص کوشش اور محنت اور وسیع تحقیق و تدقیق کے میر صاحب کی لائف لکھنا نہ لکھنا برابر ہے۔ اے خدا تو کسی فردِ کامل کو اس ضروری کام کی کافی اطمینان سے ہمت دے۔ میر صاحب کا کلام مطبع اودھ اخبار لکھنؤ نے چھوٹی چھوٹی تین جلدوں میں شایع کیا ہے لیکن ابھی بہت بڑا حصہ شایع ہونے سے باقی ہے کاش کوئی مطبع میر صاحب کی رباعیات۔ سلام۔ مراثی کو فراہم کر کے شاہنامہ جیسی شاندار کتاب مرتب کرے اور اُسکی تدوین خاص اہتمام سے کی جائے تو ایک بہت بڑا فرض ادا کرنے والا ہو سکتا ہے۔ میں نے میر انیس غفراں مآب کو

دوم مرتبہ دیکھا اور اُن کی زبان سے مجلس میں اُن کا یہ مرثیہ سُنا ہے۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اپنی تمام عمر میں میر انیسؔ سے زیادہ کسی کو فصیح البیان پایا ہو۔ اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ میر انیسؔ کے تحت اللفظ پڑھنے میں اُن کی خوش بیانیاں وہ لطف پیدا کرتی تھیں جو صرف اُن کا حصہ مانا جاتا ہے۔ ہر سال عظیم آباد میں محرم کی مجلسیں پڑھنے تشریف لیجاتے تھے ہزاروں روپیہ اس قسم کی نذر و نیاز سے ملتا تھا ایک مرتبہ سالار جنگ نے حیدرآباد میں طلب کیا تھا۔ وہاں تیرہ روز رہے۔ سر سالار جنگ نے تیرہ ہزار پیشکش کئے۔ اور سر آسمان جاہ بہادر نے چاہا کہ میر صاحب ممبر پر ٹوپی پہن کر بیٹھنے کی جگہ حیدرآباد کی منصبداری پگڑی رکھکر بیٹھیں تو ایک مجلس کے دس ہزار پیشکش کئے جاسکتے ہیں مگر میر صاحب نے کہا کہ میں اہل بیتؑ کے دربار میں جس وضع سے حاضر ہوتا ہوں اُس کے خلاف گوارا نہیں کرسکتا اور آخرکار دس ہزار چھوڑے مگر اپنی ٹوپی کا منصبداری پگڑی کے عوض میں سر سے اُتارنا قبول نہ کیا۔

قطعہ

ملا انیسؔ سے میں لکھنؤ میں ہوں دوبار
انیسؔ کا نہیں اُردو زباں میں مثل کوئی

کلام اُن کا جواب کلام فردوسی ہے
براق بن کے نکلتا انیسؔ کا گھوڑا

لکھی جو صبح تو کاغذ پہ روشنی پھیلی
کیا جو صورت وادیٔ کربلا کو رقم

دکھائی باغ کے نشو و نما کی گر حالت
تمام طرز بیاں سہل ممتنع اُن کا

زباں کوثر و تسنیم سے دُھلی اُن کی

انیسؔ وہ جو خدائے سخن ہیں بے تکرار
لٹا گئے وہ معانی کے گوہر شہوار

بیان اُن کا بیانِ کلیمِ خوش گفتار
جوابِ صاعقہ دیکھی انیسؔ کی تلوار

لکھی جو شام تو گیسوئے حور تھے اشعار
تو اُس کے سامنے تھے گر گلشن و گلزار

تو چلنے لگ گئی صحنِ چمن میں بادِ بہار
جو تھا انہیں کو آساں وہ غیر کو دشوار

دہانِ معدنِ گوہر بیان لولو بار

انیس شاہِ اودھ کے سلام کو نہ گئے
کھلا تھا اُن کے لئے اہلبیتؑ کا دربار

طبیعت اُنکی روانی میں ابرِ نیساں تھی
برستے اُس سے ہمیشہ تھے گوہرِ شہوار

خدا گواہ کبھی یہ فصاحتیں نہ سُنیں
بربِّ کعبہ نہ ایسا فصیح خوش گفتار

بلاغتوں کے لگے ڈھیر ہر طرف اُنکے
فصاحتوں کے لگے اُنکے سامنے انبار

انیس اُن کا تخلص ببر علی تھا نام
نہ لکھنؤ کے شرف بلکہ تھے وہ فخرِ دیار

میں اُنکی کثرتِ تصنیف کو بتاؤں کیا
سُنا عزیزوں سے ہیں اُنکے ڈھائی لاکھ اشعار

کیا انیس نے احسان زبانِ اردو پہ
انیس وادیٔ اردو کو کر گئے گلزار

رباعیوں میں بھری ہیں بلاغتیں کیا کیا
مسدّسوں میں نظر آئے مثنوی کی بہار

جو نکتہ چیں ہیں سلاموں سے چھانٹ سکتے ہیں
غزل کے رنگ قصیدے کی طرز کے اشعار

ہر ایک صنفِ سخن پر انیس قادر تھے
وہ ایک رنگ میں دکھلا گئے چمن کی بہار

حسینؑ ابنِ علیؑ کو ملا ہے وہ حسّان
کہ جس سے بلبلِ سدرہ کی بند ہو منقار

وہ دیکھو گھوڑے سے لشکر کی آمد آمد کو
وہ دیکھو آتا ہے کس شان سے علمبردار

وہ گھوڑی ٹاپوں سے کس طرح روندتی ہے زمیں
وہ دیکھو چلتی ہے کس کس بناؤ سے تلوار

وہ باندھتے ہیں کمر کس شکوہ سے غازی
وہ کیسی ہلتی ہے شیروں کی ڈونکنے سے کچھار

ہیں شاہنامہ میں صدہا لڑائیاں لیکن
کیا انیس نے اک جنگِ مختصر کو ہزار

ہزار طرح سے لکھا ہے اک لڑائی کو
ہزار طرح سے کھینچی انیس نے تلوار

ہزار طرح سے باندھا ہے اک مضموں کو
ہزار طرح سے دوڑائے توسن و رہوار

وہ جھک پڑے ہیں کہیں گر سبو و ساغر پر
تو پھر ہے سرد ظہوری کی گرمیٔ بازار

وہ فنِّ مرثیہ گوئی کو علم کر کے گئے
ہیں اس پہ حجتِ قاطع انیس کے اشعار

ملے وہ مبدءِ فیاض سے انہیں مضموں
جو اہلِ بیت کے ہیں خاص قابلِ دربار

دبیر اُن کے مقابل ہوئے سخن آرا
بڑے شکوہ سے دکھلائی ہیبتِ گفتار

مگر انیس کو فردوسیٔ سخن پایا — دبیر مثل نظامی ہوئے مرصع نگار
انیس مہر سپہر کمال فن سخن — دبیر ماہ کمال سپہر عز و وقار
شعاع مہر کلام نفیس سے پیدا — کلام افرخ شب مہ کی طرح پر انوار
بڑے بڑے علما ان کے حامل معنی — بڑے بڑے ادبا انکے ناقل گفتار
بڑے بڑے فصحا ان کے قابل بندش — بڑے بڑے بلغا انکے واصف اشعار
کہا یہ مجھ سے مگر جناب شبلی نے — کہ میں انیس کی لائف لکھوں بسمع کبار
مگر زمانہ نے فرصت نہ دی کہ لکھ سکتا — ہوں اب بھی تنگئ فرصت سے اشہری لاچار

میر انیس اور میر مونس میر انیس کے حقیقی بھائی ہوتے ہیں۔ اور دونوں مرثیہ گوئی میں فخر خاندان ہیں میر نفیس میر انیس کے بیٹے ہیں جو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں اپنے نامور باپ کے بہت کچھ مشابہ پائے گئے اور زمانہ نے میر انیس کے بعد انکی بھی ویسی ہی قدر کی جو انکے سزاوار تھی۔ اور میر وحید میر انس کے بیٹے ہیں جو اپنے خاندان میں لاثانی طبیعت لیکر آئے تھے۔ لیکن اب ان صاحبوں میں سے کوئی باقی نہیں راقم ہیچمدان نے سب کو دیکھا اور سب کی سامع نوازی سے مستفیض ہوا ہوں۔ خصوصاً میر نفیس کو لکھنؤ اور حیدرآباد میں جی بھر کر سنا ہے۔ جہاں سُنّی شیعہ ہندو مسلمان علما، و ادبا صرف انکے اشتیاق میں جمع ہوتے تھے اور بڑے بڑے عالی درجہ امیر اُن کی جانب ہمہ تن محو نظر آتے تھے۔

میرزا دبیر

لکھنؤ میں میرزا دبیر میر انیس کے فاضل ہمعصر اور مرثیہ گوئی میں قابل مقابل تھے۔ میر انیس کو اُردو کا فردوسی کہیں تو میرزا دبیر کو اُردو کا خاقانی کہنے میں کچھ تامل نکرنا چاہیئے۔ میرزا دبیر نے مرثیہ کہنا اہل بیت اطہار کے جوش تولّا سے اختیار کیا۔ وہ ایک سید کے احترام میں ایسی فروتنی ظاہر کرتے تھے جو اس زمانہ میں کمیاب ہی میرزا صاحب کو عربی کے ادب اور عقاید کی کتابوں سے خاص دلچسپی تھی اور فارسی کی اعلیٰ تصنیفات بھی ہمیشہ زیر نگاہ رہتی تھیں اس لئے عربی اور فارسی کی ترکیبات اور شکوہ کلام نے انکی شاعری میں ایک خاص طور کی آمد اور آورد کو جگہ دی تھی وہ اُردو کے لفظوں میں عربی اور

فارسی کے بڑے بڑے مطالب لانا چاہتے تھے اور اسی لئے انکو بعض جگہ تعقید کی پرواہ نہوتی تھی کیونکہ وہ تعقید کی لحاظ سے ایک عالی مضمون کا چھوڑنا نہ چاہتے تھے میرزا دبیر کے کلام سے بانتہا اعلیٰ مطالب کا اقتباس کیا جاسکتا ہے میرزا صاحب کی تصنیف کا صحیح شمار معلوم نہیں مگر میر انیس کی ساتھ ساتھ انکو بھی دیکھنا چاہیے۔

میرزا دبیر کے کثیر مراثی اور سلام اور رباعیات میں سے تین جلدیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں کاش تمام کلام ایک جگہ جمع کرلیا جائے تو اردو شاعری کا ایک قابل قدر ذخیرہ ہوسکتا ہے راقم کو بزمانہ قیام لکھنؤ اکثر میرزا صاحب سے حصول نیاز کا موقع ملا ہے۔ میرزا دبیر کا انتقال میر انیس کے بعد ہوا۔

امیر مینائی

کہتے ہیں کہ زمانہ مشکل سے سو برس میں ایک ذی کمال پیدا کرسکتا ہے جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی بھی انہیں ذی کمال افراد میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ منشی صاحب منشی مظفر علیخاں اسیر کے شاگرد رشید ہیں۔ طبیعت کا اصلی مذاق صوفیانہ تھا۔ نواب کلب علی خاں بہادر فرمانروائی رام پور خلد آشیاں نے تمام ہندوستان سے منتخب کرکے منشی صاحب کو اپنا استاد بنایا تھا۔ اور آخر وقت تک وہ منشی صاحب کو اپنے دربار کی عزت سمجھتے رہے۔ میں نے حضرت منشی صاحب کو رامپور اور بھوپال میں دیکھا اور آخر میں اُس قدسی پیکر کی حیدر آباد میں زیارت کی ہے۔ ایک زمانہ میں خطوط کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

منشی صاحب کا کلام غزل قصیدہ دونوں میں اُن کا کمال ظاہر کرتا ہے۔ تین دیوان منشی صاحب کے چھپ چکے ہیں۔ ان میں ایک دیوان نعت جناب سرور کائنات میں ہے۔ اردو کی دنیا میں کسی کا کلام نعت اس مرتبہ کا نہیں۔ شاعری کے علاوہ منشی صاحب نے ایک لغات اردو کی تدوین میں اپنی وسعت معلومات کا اظہار کیا۔ جو حصہ لغت کا چھپکر شائع ہوچکا وہ آپ ہی اپنا نظیر سمجھا جاتا ہے اور انگلستان کی علمی سوسائٹی میں بھی اس کو قبولیت خاص کا درجہ حاصل ہے چنانچہ مسٹر آر۔ برن نے جن کی کئی پشتیں ہندوستان کی خدمات میں گذریں اپنی عالمانہ تحقیقات ہند کے متعلق اپنی تصنیف میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی اور اُن کی قابل قدر امیر اللغات کا ذکر کیا ہے

مسٹر برن یہ بات چاہتے ہیں کہ یہ لغات مکمل ہو جائے اور اس نظر سے وہ یہ رائے دیتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو نواب صاحب بہادر رامپور کو جن کی فیاضانہ امداد سے اس کتاب کا آغاز کیا گیا تھا اپنی خدمات اس کام کے واسطے تفویض کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہایت افسوس کا مقام ہوگا کہ باقیماندہ کتاب نہ چھاپی جا سکے۔ (دیکھو انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ۔ ۲۵ جولائی ۱۹۰۰ء)

آخر ۱۹۰۰ء میں منشی صاحب کا انتقال حیدرآباد دکن میں ہوا۔ ان دنوں راقم بھی حیدرآباد میں موجود تھا۔ بنارس میں حضور نظام نے منشی صاحب کو حیدرآباد آنے کا ایما فرمایا تھا۔

جب منشی صاحب بھوپال پہونچے۔ تو بعض عوارض کی شکایت تھی۔ جناب نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیہ سابق بھوپال نے چار ہزار روپیہ پیشکش کیے اور پندرہ روز اپنے آراستہ باغ میں مہمان رکھا۔ اور فرمایا کہ اب آپ یہیں رہیں کہیں نہ جائیں۔ مگر موت کی کشش کا روکنے والا کون تھا۔ آخرکار حیدرآباد تشریف لیگئے۔ اور حضور کے ایما سے جناب داغ کے مہمان ہوئے اور چند روز بعارضہ پیچش مبتلا رہکر انتقال فرمایا۔ منشی صاحب کے تلامذہ میں جلیل اور ریاض اپنے استاد کی قابل قدر یادگار ہیں حضرت جلیل حیدرآباد میں ہیں اور جناب ریاض اپنے ریاض الاخبار کے اڈیٹر اور مالک۔

اوج

میرزا دبیر لکھنوی خاقانی اردو کے فرزند رشید میرزا اوج سلمہ اللہ تعالیٰ مرثیہ گوئی میں اپنے مشہور باپ کے نامور بیٹے ہیں۔ میرزا اوج کے کلام میں متانت رہی ہے جو اُن کو جناب دبیر مغفور سے وراثتاً پھونچی اور کلام کی بندش میں صفائی خاص اُن کی طبع زاد ہے۔ راقم نے حیدرآباد میں نواب فیاض علی خاں صاحب کی آراستہ و پیراستہ مجالس میں میرزا اوج کو تحت لفظ پڑھتے سنا ہے جہاں تمام حیدرآباد کے امرا و اکابر جمع ہوتے تھے۔ اور اُن کے ہر بند پر صل علیٰ و سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

تسلیم

منشی امیر اللہ تسلیم سے رامپور میں ملا ہوں اور جناب تسلیم کا کلام اُن کی زبان سے سُنا ہے اب سن شریف قریب ستر برس کے ہوگا۔ اردو میں صاحب دیوان ہیں اور مثنوی شام غریباں

آپ کے اداے سخن کی بہترین نمونہ ہیں۔ نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں۔

انوار حسین تسلیم

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کو فن تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ آپ نے اقسام تاریخ پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور یہ کتاب مطبع نیر اعظم مرادآباد میں چھاپی گئی ہے۔ میں نے لکھنؤ میں دیکھا تھا

جلال لکھنوی

لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ نواب کلب علی خاں فرمانروائے سابق رامپور کی قدر شناسی نے انکو اپنے دربار میں جگہ دی تھی۔ جناب داغ بھی اُن کو مانتے ہیں۔ علم عروض میں دوسروں سے ممتاز ہیں۔ دیوان جلال چھپ چکا ہے کلام میں سلاست کے ساتھ متانت اُستادی کے درجہ میں لئے ہوئے ہے۔ راقم نے دیکھا نہیں کلام سے لطف سخن حاصل کیا ہے۔

فصیح الملک نواب میرزا خاں داغ

جناب داغ کی تعریف مستغنی عن البیان ہے۔ دوسرے حضور نظام حیدرآباد کی اُستادی اور پندرہ[15] سو روپیہ ماہوار کی ملازمت نے اُن کو سب تعریفوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ جناب داغ کے تین دیوان ہیں اور سنتا ہوں کہ چوتھا دیوان بھی نکل چکا ہے لیکن جناب داغ کی شاعری کا دلچسپ اور بہترین نمونہ پہلا دیوان موسوم بہ گلزار داغ ہے داغ کے کلام کی سادگی میں اداے کلام وہ مزہ دیجاتی ہے جو داغ اور صرف داغ کا حصہ ہے۔ اور موجودہ زمانہ کا سلیس اور سادہ مذاق غزل کے لئے داغ کی زبان اور داغ کے انداز بیان کی نسبت خاص دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ اور اسباب میں داغ کو جو بات حاصل ہو گئی ہے وہ عام مذاق پر اثر ڈالنے والی ہے اور تمام ہندوستان کی محفلوں اور عیش و نشاط کے جلسوں میں جتنی غزلیں داغ کی گائی جاتی ہیں کسی کی نہیں گائی جاتیں۔

جناب داغ خواجہ ابراہیم ذوق کے شاگرد رشید ہیں۔ دلی سے نکل کر نواب کلب علی خاں فرمانروائے رامپور کی قدردانی سے دربار رامپور میں جگہ پائی اور نواب خلد آشیاں کے بعد تقدیر کی یاوری نے حیدرآباد پہنچایا حضور نظام کا اُستاد بنایا۔ جب جناب داغ حیدرآباد کو تشریف لیگئے تو راقم وہاں موجود

تھا اور خدا بخشے مولوی سیف الحق صاحب ادیب دہلوی نے مجکو اُن سے ملایا تھا۔

مولانا حالی

مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی قصبہ پانی پت کے متوطن ہیں مگر ساری عمر دلی کی صحبتوں میں گزری۔ خواجہ ابراہیم ذوق۔ حکیم مومن خان۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ مفتی صدر الدین خاں۔ نواب علاء الدین خاں رئیس لوہارو۔ میرزا اسد اللہ خان غالب جیسے ادبا و شعرائے کاملین کی ہم بزمی کا موقع پایا۔ مولانا حالی کی شاعری دو صورتوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ جو اُن کے دیوان میں پائی جاتی ہے جو شاعری کا موضوع ہے دوسرے وہ جس کو زمانے کے مذاق اور ابنار زمانہ کی سخن فہمی کا اندازہ کرکے انہوں نے اختیار کیا۔

میں اس ادب کے مقام میں کچھ بولنا نہیں چاہتا۔ مگر مجکو اپنی طبیعت اور اپنی رائے کا اختیار ہے۔ میں اُن کے طرز قدیم کو شاعری جانتا ہوں اور دوسرے طرز کو نظم اور صرف نظم۔ مولانا حالی کا دماغ من حیث شاعری کے اکثر دماغوں سے زیادہ روشن ہے جس کے کمروں میں زمانہ شموع کافوری کی جگہ کیروسن آئل کی روشنی پسند کرتا ہے۔ ؎

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھکر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھکر

مولانا حالی کی تصنیف شریف اور تالیف لطیف سے سرسید احمد خاں کی لائف حیات جاوید۔ دیوان حالی۔ مسدس جزر و مد۔ یادگار غالب۔ حیات سعدی۔ اور متعدد نظمیں اُردو کی دُنیا میں بقائے زمان تک اپنی یاد قایم رکھنے والی ہیں۔ راقم کو کئی مرتبہ مولانا سے حصول نیاز کا موقعہ ملا ہے۔ اب سن شریف ساٹھ سال کے قریب ہوگا۔ مولانا حالی پرانی وضع کے ایک ایسے قابل قدر بزرگ ہیں جو علم ارثماطیقی میں نو کے ہندسہ کی طرح کبھی اپنی وضع کو نہیں چھوڑتے۔

نو ۹
نو دونی۔ ۱۸ آٹھ اور ایک نو۔

نوتیا ۲۷- سات اور دو نو۔

نوچوک ۳۶- چھ اور تین نو۔ نو پنجے ۴۵- پانچ اور چار نو

اسی طرح دس تک چلے جاؤ۔ ہر نتیجہ نو کو کم زیادہ کرتا ہوا نہ پاؤ گے۔

ریاض خیرآبادی

منشی ریاض احمد ریاض خیر البلاد خیرآباد کے متوطن ہیں جس سرزمین سے بڑے بڑے نامور عالم فاضل شاعر پیدا ہو چکے ہیں۔ اور ابھی تھوڑے زمانہ پہلے تک مولانا فضل حق اور اُن کے بعد اُن کے نامور بیٹے مولانا عبدالحق جیسے علامہ روشناس عالم تھے۔ شاعرانہ مذاق میں بھی خیرآباد کا نمبر بہت بڑھا ہوا ہے۔ ریاض۔ مضطر۔ وسیم جیسے رعنا خیال اور کہاں نظر آتے ہیں۔ جناب ریاض حضرت امیر مینائی کے شاگرد رشید ہیں۔ لیکن انداز بیان میں فصیح الملک داغ کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ ریاض کی طبیعت غزل کے حقیقی معنی سخن با محبوب گفتن کو خوب سمجھے ہوئے ہے ریاض کی ترکیب ادابندی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ داغ کی طرح بزم محبوب میں پوری رسائی رکھتے ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں ایک گزری ہوئی کیفیت کا نمونہ ہوتا ہے۔ ریاض کے استعارات کی رنگینی خاص قسم کی ہے۔ اور ریاض کی نثر میں ایک خاص رعنائی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ ان آوازوں پر کان لگائے رہتے ہیں وہ ریاض کی نظم و نثر سُن کر کہہ سکتے ہیں کہ ہو نہ ہو ریاض کی سی آواز ہے۔

مضطر

جناب مضطر سے میرا تعارف نہیں مگر اتنا جانتا ہوں کہ وہ نواب ابراہیم علی خان بہادر رئیس ٹونک کے ہواخواہ اور مصاحب خاص ہیں۔ اور اُن کا نہایت دلچسپ اور دل پر اثر ڈالنے والا کلام مختلف گلدستوں میں دیکھا ہے اور اس کلام سے موضوعات شاعری کا قابل قدر پتہ ملتا ہے جو اُردو کی شاعری کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

شوکت

حسان الہند مولانا شوکت نزیل میرٹھ میدان مناظرہ میں مرد اور اپنی ژرف نگاہی اور بہتات

خیال ہیں جوہر فرد ہیں - اخبار طوطی ہند اور شحنہ ہند اور رسالہ پروانہ اُن کے مقالات شاعری کی شاہراہ اور اُن کے خیالات رفیعہ کے جولانگاہ ہیں - ہمارے فاضل مخدوم نے مثنوی خاقانی غالب کے اشعار کا جو حل کیا ہے وہ اُردو کی لائبریری میں بہت بڑی عزت سے جگہ پانیکے قابل ہے -

منیر شکوہ آبادی

منشی اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی کی استعداد علمی کو فاضلانہ درجہ حاصل ہے - غدر ۱۸۵۷ء کی رستخیز بیجا میں پکڑ کر کالے پانی کو بھیج دیئے گئے تھے - اور مولانا فضل حق خیر آبادی کو بھی وہاں بھیجا گیا تھا - مولانا فضل حق نے کہا کہ اُردو میں عربی کی سی گنجائش نہیں اور عربی کا اور ایک قصیدہ پڑھا - منیر نے اُسی جوڑ کا قصیدہ اُردو میں لکھا جو اُن کے کلیات میں موجود ہے - نواب کلب علی خان بہادر فرمانروائے رام پور کی قدر دانیوں سے - امیر - داغ - جلال - منیر - شاعری کے اربعہ عناصر بن رہے تھے - منیر کی شاعری کا مذاق سب سے علیحدہ ہے - منیر کی شاعری سے ہندوستان کے خاص مذاق کا اندازہ ہوتا ہے - منیر کی قدرتِ کلام کا اندازہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اُن کے کلیات کو دیکھا جائے جو ایک مرتبہ چھپ کر کمیاب ہو رہا ہے - منیر انتہا کے خوش بیان تھے - اُن کی باتوں میں عجیب دلربائی تھی - راقم نے منیر کو اُن کی آخر عمر میں دیکھا ہے - جبکہ اُن کا سن ساٹھ برس سے زیادہ ہو چکا تھا - مگر منیر کی شگفتہ مزاجی اُن کو جوان بوڑھوں میں یکساں محبوب بنائے رکھتی تھی -

قلق

جنابِ آفتاب الدولہ قلق کو میں نے اُس وقت میں دیکھا تھا جب کہ وہ آفتاب لب بام ہو رہے تھے - قلق کا شمار اردو کے خاص شاعروں میں ہے - اور قلق کا دیوان اور اُنکی مثنوی طلسم الفت خاص دلچسپی سے دیکھی جاتی ہے - اور اُس سے زبان کے محاورات اور روزمرہ کی بول چال کا بہت کچھ پتہ ملتا ہے -

اسد اللہ خان غالب

مجکو دلّی کی آبادی اور شاعری کی دنیا میں ایک میرزا اسد اللہ خان غالب کا دیکھ لینا اس

وقت سے دلّی و سنوداتک سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے۔ ۱۲۸۵ھ ہجری میں میں نے حضرت میرزا صاحب کو الہ آباد میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانہ میں دیکھا اور ان کی شیوا بیانیوں سے بھی مستفیض ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ اور میں بھوپال میں ملازم تھا۔ جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین والیہ سابق ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت میرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور وہیں قیام فرمائیں مگر مرزا سے دلّی چھٹنا مشکل تھا۔

میرزا غالب کا اردو دیوان شاعری کی جان ہے۔ اگر اردو میں شاعری کی صورت نظر آسکتی ہے تو میرزا غالب کے دیوان میں۔ مگر اس کا سمجھنا معمولی بات نہیں۔ اس لئے مولانا شوکت کے حل غالب سے مشکل کشائی کا کام لینا چاہیئے۔ میرزا غالب فارسی کے شاعر ہیں اور ان کا فارسی کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں اُستادانہ درجہ رکھتا ہے۔ مگر دلّی کی بود و باش اور شاعری کے حقیقی مذاق نے ان کی اردو شاعری پر جو اثر کیا وہ میرزا غالب اور صرف میرزا غالب کا حصہ ہے وہ اردو شاعری میں اپنی وضع کے آپ موجد ہیں اور آپ خاتم۔ حکیم مومن خان اور اُستاد ذوق اُنکے مشہور اور مستند ہمعصر ہیں لیکن میرزا غالب کا کمال فن اور چیز ہے

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

کلام الملوک

ابو ظفر

اردو کا نشو و نما دلّی سے ہے۔ شاہ جہاں کے وقت میں یہ بیج بویا گیا۔ محمد علی شاہ کے عہد میں نشو و نما پائی۔ ابو ظفر خاتم سلطنت مغلیہ دہلی کے زمانہ میں پھول پتیوں کی کثرت ہوئی۔ اور دلّی اور لکھنؤ کے زبان دانوں نے طرح طرح کے پھل پھول نمایاں کئے یہاں تک کہ دلی کے آخری بادشاہ ابو ظفر نے بھی شاعری سے دلچسپی ظاہر کی۔ ظفر کا دیوان مشہور ہے۔ اور

اردو کی لائبریری میں ہونا ضرور ہے۔ شاہ موصوف ۱۸۵۷ء میں دلی سے رنگون کو تشریف لے گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ میری عمر اس وقت میں آٹھ نو برس کی تھی۔ خواجہ ابراہیم ذوق حکیم مومن خان میرزا غالب اس زمانہ کی خاص یادگار ہیں۔

واجد علی شاہ

حضرت جان عالم محمد واجد علی شاہ کو جو اودھ کے آخری بادشاہ ہیں۔ موسیقی اور شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ حضرت کا ایک ضخیم دیوان بہت جلی خط میں چھپ چکا ہے جو کمیاب ہے اور غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے کلکتہ کو جانا اور وہیں مٹیا برج میں قیام فرمانا ہوا۔ اور وہیں انتقال کیا۔ اختر تخلص فرماتے تھے۔

راقم نے بزمانہ حیات حضرت ارم آرام مٹیا برج میں عمارات شاہی اور رمنہ وچڑیا خانہ وغیرہ کی سیر کی ہے۔ جس کو دنیا کا فردوس کہہ سکتے ہیں۔ اور منشی امیر علی خان بہادر وزیر السلطان نے حضرت کا دیوان مجکو عنایت کیا تھا۔

نواب یوسف علی خان

طبقہ اعلیٰ میں اردو کا کلام نواب یوسف علی خان بہادر متخلص بہ ناظم فرمانروائے سابق رامپور کی متانت کلام اور امیرانہ خیال کو خاص طور سے ظاہر کرتا ہے۔ اور نواب صاحب ممدوح کو مرزا غالب سے خاص عقیدت تھی۔ نواب یوسف علی خان کا دیوان اس طبقہ کی تصنیفات میں اردو کا سرمایۂ تفاخر ہے۔

نواب کلب علیخان بہادر

رامپور کے دوسرے فرمانروا نواب کلب علیخان بہادر جن کا نام نامی اہل کمال کی قدردانی میں مشہور آفاق ہے۔ شاعری کا خاص مذاق رکھتے تھے۔ اور امیر۔ داغ۔ جلال۔ منیر جیسے باکمال شعراء کی ہم بزمی نے اُن کے مذاق پر اور صیقل کر دی تھی۔ نواب تخلص فرماتے تھے۔ نواب موصوف کی تصنیف سے کئی دیوان یادگار ہیں۔ حضور ممدوح نے اپنی تمام تصنیف جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے ذریعہ سے راقم ہیچمدان کو عنایت فرمائی تھی۔ جبکہ راقم بھوپال میں نائب مرافعہ تھا۔

نواب موصوف کے دواوین سے اُردو کے محاورات اور روزمرہ کی بول چال اور شاعری کی ترکیبات بندش کا خاص پتہ ملتا ہے۔

حضور آصف جاہ نواب میر محبوب علی خان بہادر فرمانروائے حیدرآباد

ماشاءاللہ چشم بددور اعلیٰ حضرت قدر قدرت نظام الملک آصف جاہ نواب میر محبوب علیخان بہادر فرمانروائے حیدرآباد۔ ملک اور زبان دونوں کے بادشاہ ہیں۔ اُردو میں اعلیٰ حضرت نے جناب داغ کو نواب فصیح الملک کا خطاب مرحمت کیا۔ اور پندرہ سو روپیہ ماہوار مقرر فرمائے ہیں۔ جناب داغ اعلیٰ حضرت کے اُستاد ہیں۔ حضور والا کا کلام بہت صاف اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ اور اکثر خیالات میں شاہانہ مقاصد کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اور اعلیٰ حضرت کی نظموں سے رعایا کی نسبت التفات خاص کا پتہ ملتا ہے۔ جیسا ارشاد فرماتے ہیں۔ ؎

آصف کو جان و مال سے ہرگز نہیں دریغ
گر کام آئے میری رعایا کے واسطے ؛

اعلیٰ حضرت کے وزیر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد بھی نظم اور نثر میں مشہور ہیں۔ اور اکثر غزلیات آپ کی تصنیف سے جناب داغ کے مقابلہ میں ایک ردیف و قافیہ پر شائع ہوئی ہیں اور خود حضور کے شاگرد ہیں۔ اور اُردو کی لائبریری کے لئے شاہ و وزیر کے کلام مجموعہ نظام کا ایک ایک پرچہ جمع ہونا ضرور ہے۔ راقم نے باغ عامّہ کے ایک عام جلسہ میں حضور پرنور کو گوہر افشاں ہوتے دیکھا ہے اور جناب مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد کی شیوا بیانی سے بھی بزمانہ پیشکاری مسرور ہوا ہوں جبکہ میرے دوست سرشار ملازم ڈیوڑھی مہاراجہ پیشکار نے مجکو یاد فرما کر اُس کا موقع دیا تھا۔

نواب صدیق حسن خان بہادر

نواب سید صدیق حسن صاحب خان بہادر قنوج کے متوطن ہیں پہلے سرکار بھوپال میں ملازم ہوئے پھر علیا حضرت نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ ریاست بھوپال نے اُن کے ساتھ نکاح کیا۔

اس قرب منزلت سے اُن کو نواب والاجاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خان صاحب بہادر
کا خطاب ملا۔ اور سترہ ضرب توپ کی سلامی مقرر ہوئی۔ لیکن آخر کو یہ خطاب گورنمنٹ انگریزی نے
واپس لے لیا سلامی موقوف ہوئی۔ مگر نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی شوہرپرستی کے اعزاز نے آخر وقت
تک ساتھ دیا۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب طبقۂ امرا میں آپ ہی اپنا نظیر سمجھے
جا سکتے ہیں۔ عربی کے پورے ادیب فارسی کے مستند انشا پرداز۔ اُردو کے قابل قدر نکتہ سنج
جناب موصوف کی تصنیفات عربی و فارسی و اردو کی تعداد ڈیڑھ سو نمبر سے زیادہ ہے۔ جناب موصوف
نے اپنی دلچسپی کو ایک مجلس مشاعرہ ہفتہ وار مقرر فرمائی تھی۔ اس جلسہ کو راقم سے خاص تعلق تھا۔
مولوی یوسف علی صاحب گوپاموی صدر الصدور۔ حافظ خان محمد خانصاحب شہیر۔ میرزا کمال الدین
صاحب سنجر ایرانی۔ مولوی محمد احسن صاحب احسن۔ منشی صابر حسین صبا۔ اور مولانا محمد عباس بن
ملا احمد عرب شروانی صاحب نفحۃ الیمن و عجب العجائب۔ اور نواب صاحب کے دونو صاحبزادے
میر نور الحسن خان بہادر کلیم۔ اور میر علی حسن خان بہادر سلیم۔ اور منشی کنج منوہر لال صاحب نوش۔
اور نوابصاحب بہادر کے داماد میر عبدالحی خان بہادر شریک مشاعرہ ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی
جناب نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیہ بھوپال جنت آرام کی غزل بھی پڑھی جاتی تھی۔
مشاعرہ میں فارسی اور اُردو دونوں کی طرحیں دیجاتی تھیں۔ فارسی میں نوابصاحب نواب اور
اردو میں توفیق تخلص فرماتے تھے۔ نواب صاحب کا مذاقِ تغزل نہایت قابل قدر ہے۔
نواب صاحب کا موحدانہ اور مجتہدانہ رنگ شاعری پر بھی اپنا اثر ظاہر کئے ہوئے ہے۔

ناولسٹ

اُردو کے ادب میں اُردو کے جدید مذاق ناول کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ اگرچہ اُس کے بعض
خیالات کو مہذب گروہ ناپسند کرتا ہو بلکہ اُس کے انداز مقال اور انشا پردازی کا لحاظ کرنا چاہیے
کیونکہ زبان دانی کے لئے اُن سے نہایت بیش بہا فقرات کا اقتباس کیا جا سکتا ہے جس
سے بہتر لکھنا معمولی بات نہیں۔ میں اس موقع پر پنڈت رتن ناتھ سرشار کا نام سب سے پہلے لیتا ہوں

جنکے ناولوں میں مختلف سوسائٹیوں کے طرز بیان کا دلچسپ خاکہ موجود ہے۔ دوسرے مولانا عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی جن کے ناولوں میں دلچسپی کے ساتھ کلام کی متانت کا خاص حصہ ہے تیسرے حکیم محمد علی صاحب جن کی لطافت طبعی اور حکیمانہ ادراک نے جعفر و عباسہ۔ اور جان وہنوریا۔ اور دوسرے ناولوں میں قابل قدر نقاشی کی ہے۔ یا ایسے ہی اور ناول اور ناول نگار جن کے طرز بیان سے اردو کی شاعری اور اردو کے ادب پر کوئی مفید اور دلچسپ اثر پڑ سکتا ہے اور ان کے پسندیدہ لفظوں اور قابل قدر ادائے کلام سے ناطقہ افروزی کی جا سکتی ہے۔ میرے نزدیک اکثر ناولوں میں لفظوں کو اس سلیقے سے بٹھایا اور لفظوں کو جوڑ کر اس دلچسپی سے فقرہ بنایا گیا ہے جو بہت کچھ قابل قدر ہے

خواتین شاعرہ

علیاحضرت نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیۂ بھوپال

واضح ہو کہ راقم ہیچمدان کو بھوپال میں بائیس برس کا ملازمت کا تعلق رہا۔ اور سالہا سال علیاحضرت نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ جنت آرام والیہ سابق ریاست بھوپال کے حضور میں باریابی کا فخر حاصل رہا ہے۔ حضور ممدوحہ کا مذاق نہایت شاہانہ تھا۔ ان کی لائف کو جداگانہ ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ حضور موصوفہ کو شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ اور استعداد علمی بھی رئیسانہ درجہ میں بہت کچھ قابل قدر تھی۔ حضور ممدوح پہلے شیریں تخلص فرماتی تھیں پھر اپنا تخلص تاجور مقرر کیا۔ حضور ممدوحہ کے دو دیوان ہیں۔ اور آخر میں ایک مثنوی تصنیف کی جس میں ہر سینری کا نیچرل سماں لکھا ہے۔ حضور موصوفہ کو بھاشا سے بھی دلچسپی تھی۔ اور کبھی کبھی بھاشا کی ٹھمریاں تصنیف کرتی تھیں۔ حضور ممدوحہ کے زمانۂ آخر کی جلیسوں میں نواب آرا بیگم صاحبہ اور چھوٹی بیگم صاحبہ خاص طور پر قابل یادگار ہیں۔ چھوٹی بیگم صاحبہ دلی کی رئیس زادیوں میں دو بہنیں تھیں۔ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے بڑی بہن کی شادی اپنے خاندان میں میاں عالمگیر محمد خاں صاحب سے اور چھوٹی بیگم کی شادی ان کے چھوٹے بھائی صدر محمد خاں صاحب سے کر دی تھی۔ چھوٹی بیگم کی

بڑی ہمشیر کا انتقال پہلے ہو چکا تھا اور چھوٹی بیگم کا انتقال نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کے انتقال سے کچھ پہلے دلّی جاکر ہوا۔ چھوٹی بیگم اور بڑی بیگم دونوں کے دیوان یادگار ہیں۔ اور چھپ گئے ہیں اور نواب آرا بیگم صاحبہ نواب علی نقی خاں بہادر وزیر بادشاہ اودھ کی نواسی ہیں۔ جو نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد بھوپال سے تشریف لے گئیں اُنکا کلام میں نے نہیں سُنا۔

قطعہ بیادگارِ رحلتِ جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ

میں اٹاوہ سے چلا صورتِ نبضِ مضطر
صبح کو اُٹھ کے گیا باغِ نشاط افزا میں
دیکھی اس باغ میں اک قبرِ مصفّا میں نے
کیا کہوں قبر کی مٹی میں ملا ہے کیسا
کیا بتاؤں تمہیں کیسی تھی کتابی صورت
دیکھنا ہو تمہیں ہمت کا نمونہ اُن کی
ایک مسجد وہ بنا کی تھی کہ ثانی اُس کا
فرش تھا شیشہ کا اٹلی سے منگا کر رکھا
آگئی اُن کی قضا رہ گئی مسجد باقی
شوقِ تعمیر میں تھیں شاہ جہانِ ثانی
ہائے اس طرح اکیلا تو نہ دیکھا تھا کبھی
بادشاہوں کی صفت رکھتی تھی اُنکی فطرت
ہائے اب کوئی نہیں پوچھنے والا اتنا
راج ہٹ رکھتی تھیں اور خیر سے تریا ہٹ بھی
جو کہا مُنہ سے کیا ہمتِ عالی سے وہی

آیا بھوپال میں جوں آب میں آتا ہے بشر
جس میں طوبیٰ سے نظر آئے سرافراز شجر
مدفنِ شاہ جہاں بیگم والا گوہر
ہائے وہ جسم ملا جاتا تھا غازہ جسیر
کیا کہوں کیسی تھی پر نور جبینِ انور
دیکھے بھوپال میں وہ تاج محل کو جاکر
دیکھنے میں نظر آتا نہ میانِ کشور
اور یورپ کا بنوایا تھا اُس کا ممبر
پڑھ سکیں ہائے وہ اُس میں نہ نماز آخر
جود و اکرام میں رکھتیں نہ تھیں اپنا ہمسر
پاس حاجب ہے نہ دربان نہ کوئی نوکر
شہریاروں کے خیالات تھے اُنکے یکسر
حال کیسا ہے گزرتی ہے کہو کیا دل پر
تھا نہ داماد سے مطلب نہ خیالِ دختر
ویسے اکا انہیں کھٹکا نہ رزیڈنٹ کا ڈر

آیۂ فاعتبروا یا اولی الابصار پڑھو تو	اور دیکھو یہ ہے دنیائے دنی کا منظر
اشہری تا کجا یاد کروگے اُن کو	آہ و شیون سے نہیں ضبط فغاں ہی بہتر

خاص محل

حضرت جان عالم محمد واجد علی شاہ ارم آرام بادشاہ اودھ کے محلات معلی میں خاص محل کا درجہ خاص ہے۔ خاص محل صاحبہ کا دیوان چھپ گیا ہے۔ جب جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ سابق ریاست بھوپال کلکتہ کو تشریف لے گئیں تو خاص محل صاحبہ نے اپنا دیوان نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کو اور نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے اپنا دیوان شیریں خاص محل صاحبہ کو دیا تھا۔ مجکو بوجہ ملازمت روبکاری جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ جنت آرام پس چلمن سے حضور خاص محل کی زمزمہ سنجیوں کے سننے کا اتفاق ہوا۔ حضور ممدوحہ کی زبان بجائے خود فصاحت کی کان سمجھنا چاہیئے۔ اور نسواں کی شاعری میں اُن کی شاعری کو خاص جگہ دینا لازم ہے۔

فرخندہ بیگم

فرخندہ بیگم صاحبہ سالہا سال بھوپال میں رہیں۔ اپنا وطن بغداد بتاتی ہیں۔ بھوپال میں انکو ہزاروں روپیہ کا نقصان پہونچا۔ مگر ان کے صبر کا قدم نہیں ڈگا۔ فرخندہ بیگم صاحبہ ایرانی شریفزادیوں کا لاثانی نمونہ ہیں۔ اس زمانہ میں ایسی عفت اور عصمت اور ایسا پردہ اور ایسا شاندار صبر و تحمل فرخندہ بیگم پر ختم ہے۔ فرخندہ بیگم صاحبہ عربی۔ فارسی۔ ترکی میں بے تکلف باتیں کرتی اور پارسی میں فی البدیہہ اشعار کہنے سے حیرت انگیز کمال ظاہر کرتی ہیں۔ اور اب اردو شاعری کی بھی مشق ہوگئی ہے۔ راقم ہیچمدان کو عزیزانہ برتاؤ حاصل ہے۔

اب سنتا ہوں کہ جب علیگڈھ میں تعلیم نسواں کی ابتداء قایم ہونیکی تدبیریں ہو رہی ہیں تو جناب موسیٰ خاں صاحب نے فرخندہ بیگم صاحبہ کو بھوپال سے اپنی لڑکیوں کی خانگی تعلیم کو طلب فرمایا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ سارے ہندوستان میں ایسی مہذب اور غیور اور ادیبہ اور فاضلہ خاتون بہ دشواری کو نہیں مل سکتی۔

ضیا

یہ بی بی مولوی نظام الدین صاحب کی ہمشیر جاورہ کی رہنے والی ہیں۔ شعر کہنے سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں اور اُردو شعر بے تکلف کہتی ہیں۔ بھوپال میں جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کے بذل وعطا سے مستفیض ہوتی رہتی تھیں۔ کئی مرتبہ بھوپال آنے کا اتفاق ہوا۔ ضیا کو غزل اور قصیدہ دونوں میں قابل قدر سلیقہ حاصل ہے اور ضیاء کی شاعری سے مذاقِ علمی کا پتہ ملتا ہے۔

پس اگر اردو کی ترقی خواہ جماعت اردو کی لائبریری میں خواتینِ زمانہ قریب کو خاص جگہ دے تو وہ اردو کی دلچسپی میں خاص اضافہ کرنے والی ہوگی۔

اب شاعری کی ضرورت نہیں

موسیقی اور شاعری اُسی وقت اچھے معلوم ہوتے ہیں جب قوم ہر طرح سے آسودہ اور فارغ البال اپنے اقبال وترقی کے مزے لے رہی ہو۔ اُس کے قلوب شگفتہ وشاداب ہوں اس کی قدردانی اور دادِ سخن کے لئے کافی دولت پاس رکھتی ہو۔ اُس کی سوسائٹی اور اُس سوسائٹی کی آزادی اور تنعم میں خوف مایوسی۔ پریشانی۔ پژمردگی۔ افسردہ دلی کا نام نہ ہو برخلاف اُس کے ہماری قوم تمام دنیا میں اس خیال کا مصداق نظر نہیں آتی۔ اور ہمارا قومی ستارہ جو نسرِ طائر بن کر اوپر کو چڑھ رہا تھا وہ نسرِ واقع بن کر نیچے کو اُتر رہا ہے۔ جلیل

ستم ہے مبتلائے عشق ہوجانا جواں ہوکر	ہمارے باغِ ہستی میں بہار آئی خزاں ہوکر
یہی عالم ہے گر جوشِ جنوں میں خاک اُڑانیکا	زمیں بھی سر پہ اک دن آرہیگی آسماں ہوکر
وہ بت محوِ خرامِ ناز ہے آئینہ خانے میں	تماشا ہے کہ یوسف پھر رہا ہے کارواں ہوکر
بڑھاپا چرخ کا تیری جوانی دونوں قاتل ہیں	ستمگر تو بنا ہے تیر ہو کر وہ کماں ہو کر
ہمیں وہ تھے کہ ہوتی تھی بسر پھولوں کے غنچے میں	ہمیں اب ای فلک تنکے چنیں بے آشیاں ہو کر

نہالِ شمع میں کیا خوشنما اک پھول آیا تھا
ستم ڈھایا نسیمِ صبح نے بادِ خزاں ہو کر

اس لئے آج کل کسی کو شاعر بننے کی ہدایت کرنا یا کسی کو شاعر ہونیکی کوشش کرنا اپنے آپ کو ہنسوانا اور شاعری کو ذلیل کرنا ہے۔ اور جو عام قلوب کو موسیقی کی طرح نظم کے ساتھ خاص دلچسپی ہے وہ شاعری کے بدلے صرف نظم سے حاصل کی جاسکتی ہے لیکن جیسے موسیقی میں معمولی لوگوں کو دادرا۔ لاونی اچھے معلوم ہوتے ہیں جو موسیقی کا معیار کمال نہیں بلکہ وہ معیار دھرپد خیال ٹپہ ترانہ وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ ویسے ہی نظم کی عام دلچسپیاں شاعری کے خاص مقامات کے ہم مرتبہ نہیں ہوسکتیں۔ اور ایشیائی سوسائٹی کے علمی مذاق اور اُس کی یادگاری علامتوں کا قایم رکھنا ضرور ہے۔ اس لئے ہم کو اتنا سادہ اور بے شعور نہ ہونا چاہیئے۔ جو شاعری کے اعلیٰ مقامات کو بالکل بھول جائیں اس لئے اگر ہم شاعر بن کر شاعری کی حالت میں وہ صورتیں نہیں دکھا سکتے تو مورخ بن کر اُس کو بطور واقعہ فراموش کرنا نہ چاہیئے۔ اور وہ صورتیں مولانا روم دیوان حافظ۔ دیوان صائب۔ شاہنامہ۔ کلیات خاقانی اور اردو کے معتبر سخن طرازوں میں غالب مرحوم وغیرہ کے مرقع جات دیکھنے سے یاد رہ سکتی ہیں۔ اور عام دلچسپی کے لئے اس زمانہ کی اردو نظموں سے دل بہلانا اور کبھی موزوں طبعی کے لئے کچھ لکھنے کی کوشش کرنا کافی ہوگا۔

میر انیس کا انداز سخن طبیعت کی روانی کو عجیب رہنمائی کرسکتا ہے اور نظم سے زمانہ کی عام ضرورتیں پوری کی جاسکتی ہیں۔

بالخیر

تمّت